بے سود پیش کرتے کیوں شکل اعتراضی
مفتی ہے ان کے بس ہیں ان کے اثر ہیں قاضی
حال ان سے بن رہا ہے جیتوں کا عہد ماضی
ہر شخص کو یہ ٹھگ کر رہے ہیں راضی
غم خوار بن کے جنکو دیتے رہے دلاسے
[illegible]

گلہائے رنگ رنگ

ترجمان زندگی

ادارہ ادب

1956

ادارہ ادبیات اردو

علی منظور

بسمِ اللّٰہِ الرّحمٰنِ الرّحیم

حمد و نعت و منقبت کا سلسلہ
دے دماغ و دیدہ و دل کو جِلا
زندگی تابندگی پائندگی
یہ جزا ایسی عطا اتنا صلہ[1]

ـــــ ⓞ ـــــ
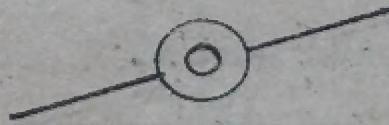
[1] میرے ایک بھانجے نے "نمودِ زندگی" دیکھی اور مجھ سے کہا :—
"منظور ماموں! ترجمانِ زندگی میں قصیدے شامل نہ کیجئے"
یہ حد درجہ ذہین اور ایم۔ اے ہیں —— میں نے ان کی بات قبول کر لی۔
"بزرگی بہ علم است نہ بہ سال"

علی منظور

فہرست

		صفحہ
دیباچہ عالیجناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ ایم۔ اے پی ایچ ڈی (لندن) معتمد اعزازی ادارۂ ادبیات اردو		

نظمیات

نمبر	عنوان	صفحہ
۱	رکن برادری	۹
۲	رسم دیرینہ	۱۰
۳	امتحان کی تیاری	۱۳
۴	تجزیہ	۱۴
۵	ہر لگے دہر رہے	۱۵
۶	عشائیہ	۱[illegible]
۷	رجب کا مبـ[illegible]	۱[illegible]
۸	پتے کی با[illegible]	۱[illegible]
۹	شاید	۲[illegible]
۱۰	پیشینگوئی	۲[illegible]
۱۱	بلائے رقصاں	۲۴
۱۲	ایک دیہاتی کنبہ	۲۵
۱۳	ہم آہنگی	۲۶
۱۴	بنا مخاصمت	۲۸
۱۵	شاہانہ بے نیازی	۳[illegible]
۱۶	ذہنیت بے پروا	۳۱
۱۷	نئی بات کونسی ہے	۳۳
۱۸	انتقامی جذبہ	۳۴
۱۹	سکۂ رائج الوقت	۳۶
۲۰	بھوک ـــ بھیک	۳۷
۲۱	شریفانہ بے نیازی	۳۸
۲۲	عالمانہ بے نیازی	۴۰
۲۳	عارفانہ شان	۴۲
۲۴	پاکیزہ کردار	[illegible]
۲۵	غیرت سوز	۴۵
۲۶	بات میں بات	۴۶
۲۷	میٹھے ٹھگ	۴۸
۲۸	غاصبانہ روش	۴۹
۲۹	شاعرانہ بے نیازی	۵۰
۳۰	رسمی پرستش؟! ـــ توبہ	۵۲
۳۱	خاکی پُر نور	۵۵

ALLAMA IQBAL LIBRARY
68123
J & K UNIVERSITY LIB
Acc No 68123
Date 25-2-69

		صفحہ
۳۲	تنویرِ داغ	۵۶
۳۳	جاہلانہ بے نیازی	۵۷
۳۴	نفی و اثبات	۵۹
۳۵	حفاظتِ ضمیر	۶۲
۳۶	کیف دیدہ وری	۶۳
۳۷	دامِ ضمائر اور نگاہِ شاعر!!	۶۴
۳۸	فرقِ زمین و آسماں.....	۶۵
۳۹	قطب از جانمی جنبد	۶۶
۴۰	ماحول بیزار سخنور سے خطاب	۶۷
۴۱	واقعیت	۶۸
۴۲	سمجھ سکتے ہیں۔ کہہ نہیں سکتے	۷۱
۴۳	تفریحِ دل	۷۲
۴۴	نشاطِ بہار	۷۳
۴۵	فرطِ مسرت	۷۵
۴۶	شعریت فلسفہ آمیز	۷۶
۴۷	کارداں بننے کی ریت	۷۷
۴۸	تحریصِ عمل	۷۹
۴۹	مفقود و موجود	۸۱
۵۰	فلسفۂ ہست و بود	۸۲
۵۱	تاریخ مہمل	۸۳
۵۲	عشرتِ آزادی	۸۴

		صفحہ
۵۳	غلطیہائے مضامیں مت پوچھ	۸۵
۵۴	باحیا باوقار، بے حیا بے وقار	۸۶
۵۶	اپنے دیہاتی بھائی سے	۸۸
۵۷	لائین یوں بدلتے ہیں	۸۹
۵۸	کایا پلٹ	۹۱
۵۹	حرفِ فسانہ	۹۲
۶۰	شناختی	۹۴
۶۱	اعتراف	۹۶
۶۲	شاذ	۹۷
۶۳	گلابی تعصب	۹۸
۶۴	تیر جستہ	۱۰۰
۶۵	عشقِ بے تاویل	۱۰۲
۶۷	کافرانہ بے نیازی	۱۰۳
۶۸	جوانی	۱۰۵
۶۹	برابر کا تول	۱۰۶
۷۰	ایک حسین تاویل	۱۰۸
۷۱	حسنِ تمام	۱۱۰
۷۲	دو دو چاند	۱۱۱
۷۳	دو دو چاند؟ نہیں ایک ہی چاند	۱۱۲
۷۴	توحیدِ مجازی	۱۱۳
۷۵	کوتل گھڑی	۱۱۶

		صفحہ
۷۶	عید کے دو پہلو	۱۱۷
۷۷	فقیرانہ بے نیازی	۱۱۹
۷۸	ایک دلچسپ مقابلہ	۱۲۱
۷۹	مابہ الامتیاز	۱۲۳
۸۰	مختصر مفید	۱۲۴
۸۱	شانِ فریقین	۱۲۶
۸۲	شہہ دینے کے ڈھب	۱۲۷
۸۳	چڑھاوا	۱۲۹
۸۴	تلخی خوشگوار	۱۳۰
۸۵	حلقہ گلی دی	۱۳۲
۸۶	آہ ٹیگور!	۱۳۴
۸۷	بشرطیکہ	۱۳۵
۸۸	وجودی رنگ	۱۳۷
۸۹	شہودی ڈھنگ	۱۳۸
۹۰	مردم دیدہ و دامانِ نظر	۱۳۹
۹۱	خوشترین قیافہ	۱۴۰
۹۲	شیریں نغمگی	۱۴۲
۹۳	عالی حوصلگی	۱۴۳
۹۴	مشاہدہ و معاملہ	۱۴۵
۹۵	اجمال تفصیل نما	۱۴۶
۹۶	میں بھی کچھ عرض کروں!	۱۴۸

		صفحہ
۹۷	اشرف المخلوقات	۱۴۹
۹۸	دستاویز زرکار	۱۵۰
۹۹	یک در گیر و محکم گیر	۱۵۲
۱۰۰	دعوت موازانہ	۱۵۴
۱۰۱	لذت تمام	۱۵۵
۱۰۲	حضور۔ غیاب حضور	۱۵۶
۱۰۳	عہد تو عشق تو	۱۵۸
۱۰۴	نونہال	۱۵۹
۱۰۵	حاتم عصر ڈاکٹر حامد علی	۱۶۱
۱۰۶	مجبوری کا عالم	۱۶۳
۱۰۷	سوال ہے یہ نہیں ہے گالی	۱۶۴
۱۰۸	کیا خوب	۱۶۵
۱۰۹	تحریک تگ و دو	۱۶۶
۱۱۰	ایک ہندستانی گریب کی بڑبڑاہٹ	۱۶۸
۱۱۱	استفہام انکاری	۱۷۰
۱۱۲	برادری کا لحاظ بیمار کو بھی!	۱۷۱
	اللہ اللہ	
۱۱۳	موجودہ تقاضے	۱۷۲
۱۱۴	غزلیات	۱۷۴ تا ۲۰۳
۱۱۵	رباعیات	۲۰۴ تا ۲۱۲
۱۱۶	اگا دگا	۲۱۲ تا ۲۱۶

دیباچہ

حضرت علی منظور ایک گوشہ نشین شاعر ہیں۔ مشاعروں اور محفلوں سے گھبراتے ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی ان شگفتگیوں اور دلچسپیوں سے دور رہنے کے باوجود ان سے گہرا شغف رکھتے ہیں اور زمانہ کے نشیب و فراز اور قدیم و جدید طرز رفتار سے بخوبی آگاہ ہیں۔

ان کی گوشہ نشینی کی ایک بڑی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ وہ بڑے ہی وضعدار واقع ہوئے ہیں اور موجودہ سوسائٹی جو ایک عبوری دور کے انتشار اور مختلف و متضاد نقاط نظر کے ٹکراؤ کا شکار بنی ہوئی ہے ان کی افتاد طبع کو بہت کم بھاتی ہے۔ وہ اگرچہ اپنی وضع چھوڑ نہیں سکتے جیساکہ ان کی اکثر نظموں اور غزلوں سے ظاہر ہوتا ہے لیکن زمانہ کے جدید رجحانات سے غیر محفوظ بھی نہیں ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ کچھ دور اس کے ساتھ بھی چلیں جیساکہ ان کی چند نظموں سے ثابت ہوتا ہے۔ لیکن اس قسم کا کلام بھی ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنی پاسِ وضع سے مجبور ہیں اور چونکہ یہ رنگ گہرا ہو چکا ہے اس کو بدلنا اب ان کے بس کی بات بھی نہیں۔ وہ اپنے رنگ ہی میں ایک ایسے باکمال شاعر ہیں اور اس وضع کو اس خوبی سے نبھاتے ہیں کہ ان میں ایک انفرادی شان پیدا ہو گئی ہے اور عہد حاضر کا کوئی شاعر اس آن بان میں ان کا حصہ دار نہیں۔

یہ ان کے کلام کا تیسرا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ۱۹۴۰ء میں ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے ان کا دوسرا مجموعہ "نمود زندگی" شائع ہوا تھا اور اس کے دیباچہ میں راقم الحروف نے ان کی خصوصیات کی نسبت جن خیالات کا اظہار کیا تھا ان میں اگر کوئی تبدیلی کی جاسکتی ہے تو وہ یہی ہے کہ ان کے اس مخصوص رنگ میں اور پختگی پیدا ہو گئی ہے اور ان کی انفرادیت اب پہلے سے زیادہ نمایاں ہے۔

وہ حیدرآباد کے ان مخصوص شعرا میں ہیں جن کا کلام حیدرآباد سے باہر بھی کافی شہرت اور مقبولیت حاصل کر چکا ہے اور اس شہر کی عزت و عظمت میں اضافہ کا باعث بنا ہے۔

علی منظور صاحب کی نشو و نما جس ماحول میں ہوئی تھی وہ اب بالکل بدل چکا ہے اور وہ سانچہ انقلاب حیدرآباد کے بعد تو بالکل ہی ٹوٹ پھوٹ گیا جس سے اس افتاد طبع کے شاعر ڈھل کر نکل سکتے تھے۔ اب جو سانچے بن رہے ہیں اور جو خمیر تیار ہو رہا ہے اس کے نتائج خواہ کیسے ہی ہوں اتنا یقین ہے کہ قناعت و کنج نشینی اور پاکبازی و پاس وضع اور امتزاج قدیم و جدید کے عمدہ نمونے اب شاید ہی جلوہ گر ہو سکیں۔

۶ر جولائی ۱۹۵۹ء　　　　سید محی الدین قادری زور

رکن برادری

جسے غم ہے سارے جہان کا — کبھی غم سے ہو نہ سکا بری
وہی خوش رہا جو گزر گیا — نظر اس پہ ڈال کے سرسری
مری اعتدال نما نظر — نہ تو سرسری نہ دقیق تر
جو حدودِ دید ہیں مختصر — ہے الم زیادہ سبک پری
مرا قال شاہدِ حال ہے — مجھے اپنے گھر کا خیال ہے
مجھے فکرِ اہل و عیال ہے — مجھے یاد اپنی برادری
میں برادری سے ہوں شادماں — ہے برادری مری قدرداں
کوئی اختلاف نہیں یہاں — نہ تو باطنی نہ تو ظاہری
وہی کام ہیں وہی کاج ہیں — وہی خاص رسم و رواج ہیں
وہی ایک ڈھب کے مزاج ہیں — وہی مشفقانہ برابری
کوئی نیچ اونچ کی سرزنش — نہ عقیدتوں میں ہے چپقلش
اسی وجہ سے یہ دلی کشش — نہیں رازدانِ گراں سری

(۲)

کبھی اس عزیز کے گھر گیا — کبھی اس عزیز کو دی صدا
کبھی ابنِ عم کو بلا لیا — جو ہے کذب و صدق کا جوہری
مرے سب عزیز ہیں دیدہ ور — نہیں کم کسی کی نگاہ مگر
گلِ سربسر ہے یہ خوش نظر — کہ مسلّم اس کی ہے برتری
ادب اس کے علم کا ترجماں — شرف اس کے حلم کا رازداں

چلن اس کا رہبر گمرہاں — روش اس کی حجتِ رہبری
اسے روکتی نہیں کوئی شئے — یہ کرے گا منزلیں یوں ہی طے
اسی خندہ رو کی جبیں سے ہے — یہ عروج داوجِ خوش اختری
نظر اس پہ کس کی نہیں پڑی — کہ نمونہ اس کی ہے زندگی
بخدا قضا و قدر نے کی — بہت اس کی حوصلہ پروری
یہ ہے اس کے خاص اثر کی حد — کوئی اس کی رائے ہوئی نہ رد
کہ برادری کا ہے معتمد — یہ شریف رکنِ برادری

جنوری ۱۹۴۲ء

رسمِ دیرینہ

شروع ہی سے ہے دلدادۂ رسوم بشر
ادھر مراسمِ دنیا، رسومِ دیں ہیں ادھر
بشر کی زندہ دلی ہے رسوم کے بس میں
جدا جدا ہیں مگر ہر مقام کی رسمیں
ذوی العقول ہیں پروردۂ جہانِ رسوم
خرد از آنِ بشر ہے بشر از آنِ رسوم
مزے حیات کے پابندئ رسوم میں ہیں
حسیں رسوم کو تاباں نجوم سمجھائیں
مزے رسوم کے موقع محل پہ لیتا ہوں
ہر اختراعِ سلف کی میں داد دیتا ہوں

قدیم تر سے ہے ضیافت کی رسم دنیا میں
برادرانِ وطن گر اسی پہ غور کریں
ضیافت اپنے افادات خود ہی کہدے گی
خلوصِ داعی و مدعو کا جائزہ لے گی

بصد خلوص دل افروز ہو گیا یہ خیال
نہ دی کسی کو بھی دعوت، گزر گئے دو سال
بس، اس کے ساتھ ہی دعوت کا اہتمام کیا
یہ اہتمام جو کرنا تھا خوب کام کیا
بھلا دیا تھا جنھیں آئے وہ عزیز بھی یاد
بلا کے شاد ہوا میں عزیز آ کر شاد
لحاظ سن کا ہر اک نے کیا بہ طرزِ قدیم
دعا، سلام، قدمبوس، بندگی، تسلیم
کسی نے نام پہ کی اکتفا بہ وقتِ خطاب
کسی نے صرف میاں کہہ دیا کسی نے جناب
چچا کو دیکھ کے خالد نے پیش گرسی کی
چچا نے دے کے دعائیں مزاج پرسی کی
سلام کرنے لگا کوئی دونوں ہاتوں سے
کسی کے دل کو لبھایا کسی نے باتوں سے
کہیں ادب کا کہیں بے تکلفی کا ظہور
ہر ایک بات کا ہر اک عزیز کو ہے شعور

کسی کو دیکھ کے اُٹھا کوئی پئے تعظیم
کہا کسی نے اشارے سے بیٹھ جاؤ ندیم

بنا ہے طفلِ دو سالہ کا ترجماں کوئی
کہ دُور سب کی سمجھ سے ہے اس کی خوشگوئی

ہوئے نصیب مجھے ایسے ایسے نظارے
ضیا سے جن کی خصائل سنور گئے سارے

یہ جبر خود ہی دھلایا جو میں نے سب کا ہات
اُجاگر اور زیادہ ہوئے دلی جذبات

یہ دل نواز جماعت یہ جاں فروز سماں
یہ اکل و شرب یہ صدق و صفا یہ دسترخوان

ادھر ہیں تیس ادھر تیس جملہ مہماں ساٹھ
مری نگاہ سے دیکھے کوئی اب ان کا ٹھاٹھ

جلالِ چشم، خوشی کے "مجسمے" ہیں آج
شگفتہ حال شگفتہ جبیں شگفتہ مزاج

زبانِ حال سے یہ کہہ رہی ہے زندہ دلی
نشاطِ عمر گرانمایہ بے سوال ملی

ملا جو وقت مداراتِ اقربا کے لئے
ادب[1] کے لطف اٹھائے مزے دعا کیلئے"

ہر ایک رسم ہے مرغوبِ دل ہر آئینہ
یہی ہے میں نے مثالاً یہ رسمِ دیرینہ

ستمبر ۱۹۴۸ء

[1] فصیح الملک داغ دہلوی فرماتے ہیں کہ
ستم کے لطف اٹھائے مزے جفا کے لئے
دو لفظی تصرف اِس مصرع کو میرا اپنا نہیں بنا سکتا۔

امتحان کی تیاری

خوابگاہ سے میری متصل جو کمرا ہے
محوِ علم ہیں میرے آٹھوں نونہال اس میں
روشن اس دبستاں میں قمقمہ ہے تجلی کا
اردگرد آٹھوں کے بیسیوں کتابیں ہیں
یہ شگفتہ چہرے ہیں میرے نونہالوں کے
مجھ کو ان کا مستقبل روشنی دکھاتا ہے
اکتسابِ نور ان سے کر رہا ہے میرا دل
راستے ترقی کے ان پہ کھلتے جاتے ہیں
دیکھتے تھے حیرت سے جو مطالعہ میرا
درس مجھ کو دیتی ہے ان کی یہ کتب بینی
لڑکیاں بھی پڑھتی ہیں پڑھ رہے ہیں لڑکے بھی
رات کو بناتا ہے دن یہ رتجگا ان کا
ان کی اس ریاضت سے باہمہ دل افگاری
ان کی آنکھ سے پردے اٹھ گئے ہیں غفلت کے
نیند کے یہ متوالے رات رات بھر جاگیں
آنکھ جب کھلی میری ہوشیار انھیں دیکھا
ان کو نیند کے جھونکے جب پیام دیتے ہیں
درحقیقت ہے بشریت کا جنگ انکی بیداری

حکمتِ شبینہ کی شان جس سے پیدا ہے
نورِ بزمِ معنی ہے علم کا جمال اس میں
یہ بھی ہے نمایندہ علم کی تجلی کا
میز پر ہیں کچھ قلمیں اور کچھ دواتیں ہیں
یا "حسین خلاصے" ہیں سارے خوش جمالوں کے
میرا غنچۂ خاطر ان سے مسکراتا ہے
تابناک ہے کتنی ان کی ہر نئی منزل
طے سلوک یہ اپنا یونہی کرتے جاتے ہیں
شوقِ علم ان کا خود اب ہے رہنما میرا
علم کے گلستاں میں روز و شب یہ گلچینی!
اس معاملہ میں تو بڑھ گئے یہ مجھ سے بھی
رات بھر رہی ہے دم انکے نورِ باطن کا
کر رہی ہے سرگوشی زاہدانہ بیداری
شمعِ دیں کے پروانے ہیں چراغ ملت کے
کھیل کود کے سن میں کھیل کود سے بھاگیں
علم کے خزانے کا پاسدار انھیں دیکھا
منہ پہ ٹھنڈے پانی سے ہاتھ پھیر لیتے ہیں
امتحان کی خاطر ہے ابھی سے تیاری!

جنوری سنہ ۱۹۴۳ء

تجربہ

لاکھ توڑے خزاں چمن پہ غضب ... ہے چمن پھر بھی اک جہانِ طرب

دشت، نذرِ غمِ تہی دستی ... زر بکف غنچہ اس میں پھوٹا کب

سرو رقصاں و بیدِ لرزاں میں ... ہمسری کا نہیں ہے کوئی سبب

نخلِ آہ و نہال باغ جدا ... نہیں ایک ان سبھی قدوں کا ڈھب

گرد آلود خاک سے پیتل ... چمک اٹھی جبیں ــــ بلا ز رجب

اس نے پیتل کو کہہ دیا سونا! ... خود کھلونا ہے طفلکِ مکتب

فرق بد اصل و پاک گوہر میں ... کیوں دکھائیں نہ بلبل و عقرب

ہیں شریف و رذیل ایسے ہی
مظہرِ لطف و رونمائے غضب

آدمی آدمی نہیں یکساں ... گرچہ فی الاصل آدمی ہیں سب

کر کے سب سے برابری کا سلوک ... دل میں پچھتائے جا رہا ہوں اب

ہم محلہ ہیں میرے شیخ گھڑو ... نام سے ہے عیاں وقارِ نسب

بھائی! آداب عرض کرتا ہوں ... خود کہا میں نے ان کو دیکھا جب

سبقت کی نہیں انھوں نے کبھی ... گرچہ میرا عمل تھا در پئے ادب

دفعتاً کل سے مجھے خیال آیا ... آخر اس سرکشی سے کیا مطلب

میں جو چپ آج ہو گیا عمداً ... چل دیئے شیخ جی بھی مُہر بہ لب

کیا قیامت ہے اے علی منظور ... ہیں گھڑو صاب[1] تک سلام طلب!!

---

[1] دکن میں صاحب کی یہی درگت بنتی ہے، اور تو اور صاحبِ عالیشان بھی بڑے صاب کہلاتے ہیں۔

ہر ملکے و ہر رسمے

نشانِ حبِ وطن ہیں وطن پسند رسوم
نہ کیوں ہو ان کی جلو میں مسرتوں کا ہجوم

یہ اتحاد کی دنیا بسانے والے ہیں
منافقات کی بنیاد ڈھانے والے ہیں

جلائے فہم ہوا جب رسوم کا مفہوم
بلاغتِ نظرِ رفتگاں ہوئی معلوم

تجرباتِ بزرگاں میں شک و شبہ کہاں
ضیا سے ان کی ہیں تابندہ تر کئی صدیاں

نہاں ہے ان کی قدامت میں اُن کی اچھائی
جمالِ فطرتِ انساں ہے محفل آرائی

مشاہدات کی رونق ہیں کیف بخش رسوم
نظر فریب رہیں گے یہ نور پاشِ نجوم

نشاطِ فلسفۂ زندگی ہیں یہ رسمیں
انھیں کی وجہ سے ہے اتحاد آپس میں

ہم ان رسوم پہ ڈالیں نگاہ غور اگر
برادری کی بنا اور بھی ہو کیف اثر

مزا ہے دل میں تو ہر ایک رسم میں ہے مزا
نہیں ہیں رسم کے پابند مستحقِ سزا

نہیں عدو کے وطن دینِ فطرتِ اے ہمدا[ں]
اسی نے حبِ وطن کو بنا دیا ایماں

وطن پسند ہے سہرے کی بھی ہوا خواہی
دل محبِ وطن اور وقفِ گمراہی ؟!

چمن وطن کا۔ چمن کے ہیں پھول سہرے میں
ملیں گے حبِ وطن کے اصول سہرے میں

حسین ہیں سہرے کی لڑیاں، کشش ہے ان میں بلا
یہ ہیں "معاہدۂ مہر و انس" کی سطریں

دمِ سحر نظر آئے جو خوش نما سہرا
چمک اٹھے چمن آرائے ذوق کا چہرہ

چلیں اشارے پہ اس کے نسیم کی لہریں
رواں دواں ہوں سرور و نشاط کی نہریں

بہار اس کی نہیں مردہ دل بشر کے لئے
بہار ہے یہ جوانانِ خوش نظر کے لئے

شباب اس سے سراپا بہار بنتا ہے
اسی سے چہرۂ نوشہ کا نور چھنتا ہے

مری نظر میں "نجوم اشتہار" ہے سہرا　　مرے خیال میں "عشرتِ مدار" ہے سہرا
وطن پسند ہیں سہرے کے تازہ تازہ پھول　　بھلا بہارِ وطن کی نہ پائے حسنِ قبول!
حلب کی ریت حلب میں یہاں کی رسم یہاں
یہی ہے عقل کا فتویٰ۔ جہاں کی بات وہاں

عشائیہ

قاروں کی طرح کون کرے زر کی حفاظت
زر جمع ہوا میں نے کیا قصدِ ضیافت
عنوانِ ضیافت اثر اندازِ حقیقی
سامانِ ضیافت طرب اندوزِ حقیقت
لڑکوں سے منگائیں کبھی یکو ان کی چیزیں
میں خود کبھی بازار گیا حسبِ ضرورت
بریانی کے چاول کا نمونہ کبھی پرکھا
جانچا کبھی گھی تاکہ بگڑ جائے نہ لذّت
بازار سے واپس جو ہوا گھر کی خبر لی
خستہ نظر آئی مجھے ہر گوشہ کی حالت
جھلسی ہوئی یہ سوزنیاں لائق نفریں
مسکی ہوئی یہ چاندنیاں قابلِ نفرت
قالین بدلوائے کہ خوش رنگ نہ تھا فرش
جالے بھی نکلوائے کہ شفاف نہ تھی چھت

حامد سے کہا خوب یہ ہنسنے کا ہے موقع
راشد سے کہا واہ چہکنے کی ہے فرصت
طاہر سے کہا ہنس کے میں دوں گا تجھے انعام
فاخر سے کہا غیظ میں کیوں آئی ہے شامت
نرمی کبھی کی تو کبھی گرمی سے لیا کام
بے وجہ یہ غصہ ہے نہ بے جا یہ عنایت
ہر کام میں بچوں نے مرا ہاتھ بٹایا
بیوی نے بھی کی میری طرح خوب مشقت
مل جل کے لگاتار کیا کام جو سب نے
ہر چیز میں پیدا ہوئی ہر نوع کی جدّت
ہونا پڑا پکوان کی جانب متوجہ
تزئینِ مکاں سے جو ملی مجھ کو فراغت
سونگھی کبھی دیگوں کی مہک، واہ ری خوشبو
دیکھی کبھی شعلوں کی لپک، ہائے ری رنگت
چکھا کبھی یخنی کا دہی، خاص ہے ترشی
کھائی کبھی زردے کی شکر، عام ہے لذّت
تھوڑی سی توجہ نے بڑا کام بنایا
تیار نظر آئی ہر اک قسم کی نعمت
از راہِ کرم وقت پہ آئے مرے احباب
احباب بھی کیسے؟ "ہمہ خوبی" "ہمہ الفت"

کھایا بھی کھلایا بھی ہنسایا بھی ہنسا بھی
ہر روز میسر کہیں ہوتی ہے یہ صحبت

جون سنہ ۱۹۴۷ء

رجب کا میلہ

سچ پوچھئے تو میلے رازِ شگفتگی ہیں
بدخواہ ان کے یکسر ناکام زندگی ہیں

بعد ایک سال کے پھر میلہ بھرا رجب کا
ہے ایک ہی یہ میلہ بلدہ میں اپنے ڈھب کا

ہم شانِ طور دامن کوہِ شریف کا ہے
ہر ذرہ بن کے سورج جلوے دکھا رہا ہے

اندازہ کیا لگاؤں کتنے تماش بیں ہیں
دو ڈھائی لاکھ سے تو ہرگز یہ کم نہیں ہیں

دیکھا یہی تماشہ دیکھا جدھر پلٹ کر
تھالی ہزار پھینکو گرتی نہیں زمیں پر

کاچیگوڑہ ادھر ہے لالہ گوڑہ ادھر ہے
آباد رہروؤں سے پوری یہ رہگزر ہے

ہیں رہگزر بھی گلشن گلچہرہ رہروؤں سے
پر کیف ہو کے گذرا ہیں خاص راستوں سے

بے شبہ آج سلطان بازار دیدنی ہے
خورشید طلعتوں کی ہر سمت روشنی ہے

یہ آن دلفریبی یہ دیدہ زیب عالم
یہ شان دیدہ زیبی یہ دلفریب چھم چھم

انساں کو بھیڑ میں جب انساں دھکیلتا ہے
ذوق آفریں تبسم چہروں پہ کھیلتا ہے

آئی نظر سرِ رہ ہر قسم کی سواری
رکشا ہے یہ، وہ تانگا شکرم ہے یہ وہ لاری

بننا پڑا "گراں رو" ہر ایک زود رس کو
رتھ کے بھی پیچھے پیچھے دیکھا ہے میں نے بس کو

خود کوتوال صاحب موقع پہ آ رہے ہیں
امن و اماں کے آئیں سب کو سکھا رہے ہیں

ہمدردیاں بھی پولس اپنی دکھا رہی ہے
آرام دے رہی ہے تکلیف پا رہی ہے

ہیں خوشنما دکانیں ہر سو سجی سجائی
ہے دل گرفتگی اب پامالِ دلکشائی

ہر قسم کے کھلونے نظروں کے سامنے ہیں ۔ باہر سے آئے ہیں کچھ، کچھ اپنے دیس کے ہیں
بچوں سے کر رہے ہیں دریافت لوگ مرضی ۔ اکثر سوال ان کے دلکش ہیں اور فرضی
فرمائشیں ہیں جتنی اُتنے کہاں ہیں پیسے ۔ خوش کر دیا کھلونے دلوا کے ایسے ویسے
مانوس ہر طرح سے ڈھب لین دین کا ہے ۔ ہنس مکھ ہے کوئی تاجر کوئی اکھڑا ہے
قیمت بڑھا رہا ہے وہ منہ بنا بنا کر ۔ راضی یہ ہو رہا ہے نرخِ مقررہ پر
ہیں آج کل کے لڑکے ہشیار کس بلا کے ۔ ہمراہ باپ کے اک، اک ساتھ ہے چچا کے
انگلی کسی نے پکڑی دامن کسی نے تھاما ۔ لال اس کی شیروانی اس کا ہرا ہے جامہ
ساتھ ان کے ہے جو لڑکی شان اُس کی دیدنی ہے ۔ کرتا ہے آسمانی گلنار دامنی ہے
کیونکر نہ خوش ہوئے گڑیا یہ بھولی بھالی ۔ اس نے بٹن دبائی اس نے بجائی تالی
بندوق یوں بہن کو کوئی دکھا رہا ہے ۔ گویا شکار اس کی زد میں اب آ رہا ہے
اس طرح خوش ہزاروں اطفال ہو رہے ہیں ۔ رد بھی رہے ہیں کچھ تو ضد کر کے رو رہے ہیں

دلوا کے دیکھو ان کو جی چاہے سو کھلونا
ہنس دیں یہ کھل کھلا کے خود بھول جائیں رونا

جون ۱۹۴۵ء

پتے کی بات

ہم سے زمیں ہے چمن ہم ہیں بہارِ زمیں دید کے لائق مکاں داد کے قابل مکیں
خرم و شاداں ادھر ہم ہیں زمیں پر یونہیں جیسے فلک پر ادھر خوش ہیں یہ انجم حسیں
اور ہیں وہ اور ہم ان سے ہمیں کام کیا ہم سے بھی پوچھیں نہ وہ آپ کا ہے نام کیا
مشورۂ جنگ ہے بحث کہیں وہ ہیں پست نہ سمجھیں کبھی ہم کو وہ بالا نشیں

صرف ستارے ہی کیا کوئی بھی ادیب کا ہو کان لگا کر سنے آج اس اعلان کو
اس میں ہے سب کا بھلا عام نہ ہو بغض و کیں رسم ہے اچھی یہی بات جہاں کی نہیں

رعد کڑکتا رہے ابر سلگتا رہے، برق چمکتی رہے ماہ دمکتا رہے
رنگ جماتی رہے اپنا شفق ہر کہیں وہ فلکی ہیں اُدھر ہم ادھر اہلِ زمیں

رعد کی فریاد کا ہم نے لیا کب اثر ربط ہے دونوں میں کیا رعد ادھر ہم ادھر
غور سے ہم نے کبھی رعد کی چیخیں سنیں؟ شور ہے وہ "ادبی" نام ہی ایسی کہیں

برق کی بے تابیاں دیکھتے ہیں رات دن دل ادھر اس کا تپاں ہم ہیں ادھر مطمئن
ربط فزا دعوتیں برق کو ہم نے نہ دیں ربط بڑھے کس طرح برق کہیں ہم کہیں

ابر کو روتا ہوا دیکھ کے ہنستے ہیں لوگ ان سے خوش ان کی فضا اُس کیلئے اس کا سوگ
دیکھ کے غمگیں اسے کون ہے اندوہگیں دیکھئے بیگانگی آپ ہیں خوش وہ حزیں

ہاں نہیں آتش زن آپ آگ یونہی لگ گئی ہو فلک آتش زدہ آپ کو آئے ہنسی
رازِ شفق مہرباں آپ کے ہے دلنشیں آپ بھلا پوچھئے آگ بجھی یا نہیں

ماہ دلِ داغدار اپنا دکھاتا رہا آپ نے کیا بار بار اس کو دلاسا دیا
بھول کے اک بار بھی پیار کی باتیں نہ کیں آپ ملائیں گے کیا اس کی جبیں سے جبیں

لیکن اگر آپ کا دوست پریشاں ہو آپ ہی کہیئے قرار آئے گا کیا آپ کو
صورتِ ہم جنس خود کیا نہیں انس آفریں دوست بھی اندوہگیں آپ بھی اندوہگیں

Jammu & Kashmir University Library
Accession No. 68123

شاید

زمیں کھا جائے کل قاروں شمائل زر پرستوں کو
نہیں تو دے خدا کچھ عقلِ ناداں تنگدستوں کو
ملول ان کو بنا دے یا انھیں بھی شادماں کر دے
تہی دستوں کا دامن گوہرِ مقصود سے بھر دے

(۲)

چراغ ان کا بجھا دے یا جبیں ان کی بھی چمکا دے
بنی آدم کی ضد ہیں جہر زادے اور مہ زادے
زمیں کیا اب بھی سورج بنسیوں کی راجدھانی ہے
یہاں کیا اب بھی چندر بنسیوں کی حکمرانی ہے

(۳)

جفاکش یہ وفاکش وہ یہ بے وہ آرا وہ خود آرا
ملول ان کا ہے سب کنبہ خوش ان کا خانداں سارا
یہ خوش نیت وہ بد فطرت یہ باہمت وہ بے ہمت
یہ بھوکے ہیں وہ نازاں ہیں اڑا کر مفت کی دولت

(۴)

یہاں رنجِ تہی دستی وہاں عشرت کے ساماں ہیں
عیاں ہے شیطنت ان کی یہ سیدھے سادے انساں ہیں

گھر ان کا گوشۂ زنداں مکاں ان کا ارم منظر
محل شداد کا ہوگا تو ہوگا اس کا ہم منظر

(۵)

نہ ہنستے خندہ رو کیونکر — یہ گلشن ہے وہ بجلی ہے
نہ روتے خستہ دل کیونکر — نہ مرہم ہے نہ پٹی ہے
انھیں ہے ستر پوشی کی تمنا وہ سنورتے ہیں
غضب ہے "ہو کے سب کچھ جو نہیں کچھ" ان سے ڈرتے ہیں

(۶)

امیروں کی بدولت کیوں ہو میرے دل میں گھبراہٹ
سنا ہے اس طرف رقصاں امیروں کا ہے اک جھرمٹ
کوئی آجائے تو کہہ دوں میں اس کی ناپ کر گردن
"بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دعا کردن"
"اجابت از درِ حق بہر استقبال می آید"
یہ تنبیہ خیال انگیز عبرت خیز ہو شاید

پیشین گوئی

مفلس کی آنکھیں بھی گریاں اس کا دل بھی گریاں ہے
ہر شئے میں یہ انجاں ہے
اس کے احساسات کی بستی بالکل ایسی ویراں ہے

جیسا شہرِ خموشاں ہے
اس کا دکھ منعم کیا جانے وہ بچپن سے شاداں ہے
اس کا چہرہ خنداں ہے
دولت پر وہ نازاں ہے

(۲)

آہ، سیاہی مائل ہے مفلس کے چہرہ کی زردی
دکھ پہنچاتی ہے سردی
منعم ہنس ہنس کر کہتا ہے کس نے یہ حالت کر دی
اُف اُف ایسی بے دردی
ہائے یہ بے دردی ہی میری غمگیں فکر کا عنواں ہے
کیسا بے درد انساں ہے
انساں ہے یا حیواں ہے

(۳)

فائدہ مفلس کی غفلت سے آج اٹھاتے ہیں کیوں سیر
جاگ اٹھے گا بھوکا شیر
جاگ اٹھنا اس کا ہے یقینی، گو کچھ ہو جائے گی دیر
آخر کب تک یہ اندھیر
لو، وہ برآمد ہونے کو خورشید سپہرِ احساں ہے
مطلع کتنا تاباں ہے
منظر کیا نور افشاں ہے

(۴)

دیکھو! رفتہ رفتہ مفلس رنگ بدلتے جاتے ہیں
پھولتے پھلتے جاتے ہیں
ان لوگوں میں بھی اب کچھ حساس نکلتے جاتے ہیں
خود ہی سنبھلتے جاتے ہیں
دیکھ کر ان آثار کو پیشین گوئی کرنا آساں ہے
گرنے کو وہ ایواں ہے
منعم جس میں رقصاں ہے

جون ۱۹۲۱ء

بلائے رقصاں

زہرہ و مشتری و کاہکشان و پروین
قمر و مہر نبیں
سب حسیں ہیں، انھیں قدرت نے بنایا ہے حسیں
وہ سنورتے ہیں کہیں!
نوعِ انساں کے مقابل ہیں ہیں ناچیز وہ سب
اس کا ہے اور ہی ڈھب
سجدہ ریز اس کے در و بام پہ ہر اوجِ طلب
یہ ہے وہ پاک نسب
حسنِ کردار ہے انساں کے لئے زیبائش
سببِ آرائش
ہو کے انساں تصنّع کی میں کرتا خواہش!
ایسی مہمل کاوش
مَیں بنوں مور! مرے دل میں یہ ارمان نہیں
میری یہ شان نہیں
صرف ظاہر کی نمائش مری پہچان نہیں
کیا میں انسان نہیں
اطلس و مخمل و دیبا و حریر و کمخواب
آج کل ہیں کمیاب

آب و تاب ان کی دکھاتا ہے ابھی اک نواب خوش ہیں اس کے احباب
اپنا کام اس کے سب احباب کیے جاتے ہیں مے پیے جاتے ہیں
جامہ زیبی پہ اسے داد دیے جاتے ہیں یوں جیے جاتے ہیں
لیکن، ان مردہ ضمیروں سے مجھے کام نہیں ہیں وہ بیدانش و دیں
اس زمانے میں یہ اسراف بھی جائز ہے کہیں میں تو ہوں چیں بجبیں
جب چلا میں رہِ نواب سے کترا کے چلا یوں بھی دل اس کا جلا
کیا سمجھتا نہیں اس چال کو نواب بھلا اس کو سمجھائیں بلا
ہے حقیقت میں یہ نواب بلائے رقصاں گہہ یہاں گاہ وہاں
مور کی طرح نمائش پہ ہے اپنی نازاں اس کے جلوے ہیں عیاں

مئی ۱۹۴۵ء

ایک دیہاتی کنبہ

نیند کے آئے جھونکے سرِ شام پھر چشمِ بے خواب تھی خواب کی منتظر
اتنے میں آ کے کھٹمل نے آواز دی نیند آئی ہوئی خوف سے اڑ گئی
گھر گئے نرغۂ فوجِ موذی میں ہم مچھروں کی جفا کھٹملوں کا ستم
کروٹیں ہم بدلتے رہیں دمبدم یہ ستمگر لہو پی کے ہوں تازہ دم!
خون پیتے ہیں ۔ ٹلتے نہیں بے پیے جسم کے سارے حصوں پہ دوڑا کیے
سر پہ چڑھ کے جو اترے جھکے پانوں پہ ہے ہمارے سراپا پہ ان کا اثر
صبح ہونے کو ہے، ہم ہیں مضطر ابھی منہ کھجایا کبھی، سر کھجایا کبھی
سوئے گردن بڑھا ہاتھ بے ساختہ کر دیا ظالموں نے خرد باختہ

اٹھ کے بیٹھے رہے یا ٹہلتے رہے
ہاتھ دونوں بہ ہر حال چلتے رہے

یہ رطوبت یہ ماحول یہ گندگی
موریوں کی یہ افراط یہ خستگی
یاں کوئی ہلتھ آفیسر آتا نہیں
ہم غریبوں کی اس کو بھی پروا نہیں
جھونپڑی یہ ہماری یہ ناچاریاں
طرفہ ٹھنڈی ہوا کی دل آزاریاں
خوابِ راحت کے ساماں کی اتنی کمی
ایک بوسیدہ کمبل ہیں دس آدمی
دل میں اس درجہ سونے کا ارماں نہاں
نیند شرمائے یوں لے کے انگڑائیاں
نیند کل آئی تھی کیا جو آج آئے گی
نیند کی آرزو یوں ہی تڑپائے گی
کیوں نہ دیکھیں ہمیں انجم دیدہ ور
قائم اللیل ایسے کب آئے نظر
قائم اللیل ہوتے تھے دیندار ہی
بن گئے قائم اللیل نادار بھی!!

تلملاتے ہوئے رات بھر جاگنا!
صبح دم کھیتیوں کی طرف بھاگنا!

اکتوبر ۱۹۴۵ء

ہم آہنگی

یاد آیا کہ مفلس لوگ تھے بارِ زمیں
منعمستان روس کا تھا زار کے زیرِ نگیں
زینتِ کتمِ عدم تھا سرفروشوں کا خروج
جاں فزا تحریک تھی لینن کی جویائے عروج
محوِ نائے و نوش تھے ہر شہر میں سرمایہ دار

تھا سُرور ان کا ابھی نا واقفِ رنجِ خمار
جگمگاتے قصر میں دقیقۂ طرب زار یہ تھی
کیفِ نو کا آئنہ کیفیتِ پارینہ تھی
زار کی پروردۂ ناز و نعم شہزادیاں
جھٹ پٹے میں ڈھونڈتی تھیں عشرت افزا وادیاں
شاہزادہ ایک تھا ـــ اس شاہزادہ کے لئے
تھے کھلونے ہی فقط اے دوست لاکھوں پونڈ کے
پڑھ رہا تھا زار کا کلمہ ہر اک سرمایہ دار
اتنے میں لینن کے لشکر کا نظر آیا غبار
بجلیاں کوندیں جو لینن کی نگاہِ قہر میں
چھا گیا رُعب اس کا قلبِ منعمانِ شہر میں
اِس "خروجِ امن پرور" نے دکھایا جو مآل
اس سے ہے آگاہ فی الجملہ ہر اک روشن خیال
دیکھتے ہیں اب بھی جو نادان خوابِ خواجگی
آئینہ عبرت کا دے گی ان کے دل کی سادگی
ثابت ایسے خواب ہوں گے ہر جگہ وحشت اثر
بندا جیسا رہے گا ویسی نکلے گی خبر
مفلسوں کا دل جو ان کے دامنِ دولت میں ہے
جان پھر سرمایہ داروں کی بڑی آفت میں ہے
تا کجا پھیلائیں یہ غربت زدہ دستِ سوال

کہتے ہیں آثار ہونے کو ہے اب "عصری بدل"

منعمانِ شہر دب کر مفلسانِ دہر سے
بھاگ جائیں گے نکل کر اپنے اپنے شہر سے

آندھیوں کی تاب لا سکتے ہیں جنگل کے درخت
نونہالانِ چمن کے دل کہاں اس درجہ سخت

یہ جفا نا آشنا پروردۂ ناز و نعم
کیا رہیں گے مفلسوں کے سامنے ثابت قدم

جب نہ پائیں گے جگہہ تک اپنے سونے کیلئے
واپس آ جائیں گے ہم آہنگ ہونے کیلئے

مفلس و منعم کی مٹ جائے گی بے معنی تمیز
مل رہے گی خود ہی جو جس کی ضرورت کی ہے چیز

اگست ۱۹۴۷ء

بناء مخاصمت

زردار نے سیکھا نہیں حق بات پہ اَڑنا　　زردار نے دیکھا نہیں شیروں کا اکڑنا

بیہودہ سیاست نے سکھایا ہے لڑنا　　کتّوں کی طرح یاد ہے ہڈی پہ جھگڑنا

مردار ہے دنیا۔ جو بھرم اس کا نکل جائے
دنیا کی یہ ناپاک سیاست ہی بدل جائے

دیندارِ حقیقی سگِ دنیا نہیں ہوتا　　ہر کوچہ و بازار میں رسوا نہیں ہوتا

غیروں کی نگاہوں میں تماشا نہیں ہوتا　　ہنس دے کوئی اس پر کبھی ایسا نہیں ہوتا

بے شبہ یہ ہر قسم کی ذلت سے بری ہے
اس کو سگِ دنیا نہ کہو شیر جری ہے

دنیا کی ہوس دین سے کر دیتی ہے بیزار — دنیا کا پرستار نہیں حق کا پرستار
جو خود بھی نہیں تزکیۂ دل کا طلب گار — آراستہ ہو ہی نہیں سکتا وہ سیہ کار

ہنس ہنس کے توا روپ نکھارے بھی تو کیا ہو
ممکن ہی نہیں چاند کا آئینہ توا ہو

قارون کو کیا خاک ابھاریں گے دفینے — فرعون کو طوفاں سے بچایا ہے کسی نے؟
کس کس کو ڈبویا نہیں دنیا طلبی نے — طوفاں زدہ ہیں اب بھی حریصوں کے سفینے

آپ اپنے کو اس طرح ڈبونا نہیں اچھا
موتی کی لڑی کے لئے رونا نہیں اچھا

حق بیں بتِ طناز کا دم بھر نہیں سکتا — بت خانۂ باطل میں قدم دھر نہیں سکتا
دولت سے محبت بخدا کر نہیں سکتا — محبوبۂ قاروں پہ کبھی مر نہیں سکتا

اس کے دل روشن میں بس اک بات ٹھنی ہے
ہم سب فقرا ہیں فقط اللہ غنی ہے

ہیں شر کدۂ دہر میں سفاک ہی سفاک — کم ملتے ہیں یاں اہلِ نظر صاحبِ ادراک
دنیا ہمہ تن جس کی نگاہوں میں ہے ناپاک — اس پاک دل انساں کیلئے کیا ہے یہاں خاک

مقطعہ ہے نہ جاگیر نہ منصب نہ وظیفہ
مجذوب کل دنیا کو سمجھتا ہے یہ جیفہ

یاں جب سے ہے "اصنام طلائی" کی خدائی — ہے جنگ ہی جنگ اور لڑائی ہی لڑائی
کرتا نہیں نادار سے زردار بھلائی — دشمن نظر آتا ہے یہاں بھائی کا بھائی

دُنیا کی محبت ہی عداوت کی بنا ہے
زردار کو نیکوں نے شرِ بدوں میں گنا ہے

نومبر ۱۹۴۵ء

شاہانہ بے نیازی

میں خسروِ مطلق العناں ہوں
خورشیدِ علم قمر نشاں ہوں
صورت وہ معنی وجاہت
بانی ہوئی میری بادشاہت
پاکیزہ گہر مرا گھرانا
ہر فردِ یگانۂ زمانہ
میراث میں پائی میں نے شاہی
بخشے صاحبِ تاج قبلہ گاہی
اپنے اب و جد کا جانشیں ہوں
منت کشِ غیر میں نہیں ہوں
میری نگہِ کرم کے خواہاں
مرزا و راجا و خانخاناں
خود سر نہیں میرے آگے خودسر
سب جھکتے ہیں میرے آستاں پر
کرتے نہ سرِ نیاز کیوں خم
خانِ دوراں و خانِ اعظم
میں نے ہی بڑھائی شان انکی
قائم ہے مجھی سے آن ان کی
جاہ و حشم و شکوہ و سطوت
مجد و کرم و جلال و عظمت
طبل و علم و سپاہ و دولت
خیل و خدم و نشان و نوبت
ہیں کس کی نوازشوں کے آثار
دربار ہے اور کس کا دربار
قدسی و ثنائی و ضمیری
عرفی و ظہوری و نظیری
ان سب کی ہے آب و تاب مجھ سے
فیضی بھی ہے فیضیاب مجھ سے
محتاج مری نظر کے سب ہیں
ان سے نہیں "منقبت طلب" ہیں

مدحت مری یہ اگر نہ کرتے
دم ان کے بزرگ میر ابھرتے

جنوری ۱۹۴۷ء

ذہنیت بے پروا

مٹائے میرے کمالوں کو گردشِ افلاک
نہیں، نہیں، میں بٹھاتا چلا ہوں اپنی دھاک
جھکائے میری نگاہوں کو برقِ پارۂ رزم؟
نہیں، نہیں، میں دکھاتا چلا ہوں جلوۂ عزم
دبائے میرے خیالوں کو جنگِ عالمگیر؟
نہیں، نہیں، میں سلکتا چلا ہوں صورتِ تیر
شکست و فتح کی دنیا ہو لاکھ زیر و زبر
جہانِ دل میں نہ ہو پستِ ہمتی کا گزر
یہ سچ ہے جب تنِ بیژن سپرد خاک ہوا
کہا شغاد نے خس کم جہان پاک ہوا
غلط نہیں کہ نریماں کے استخواں بھی نہیں
نقیب اس کے عزائم کا سیستاں بھی نہیں
بھرم تہمتن و بہمن کا کھل گیا، مجھے کیا
زمانہ ان کو مٹانے پہ تل گیا، مجھے کیا
غمِ آفریں نہیں جنگِ سکندر و دارا

کبارِ عہد یونہیں ہوں گے معرکہ آرا
مری بلا سے جو فرعون ہو گیا غرقاب
مرے خیال کی رفعت ابھی کیا ہے نقش بر آب
زمیں میں دولتِ قارون دھنس گئی دھنس جائے
قفس میں "طایرِ زریں" ابھی پھنس گیا پھنس جائے
نہیں ہے جنّتِ شداد کا نشاں، نہ سہی
نہیں ہے آتشِ نمرود میں دھواں، نہ سہی
اگرچہ ہو گئی برباد تربتِ چنگیز
یہ حادثہ بھی زمیں کا نہیں غبار انگیز
نشاط کار دغم روزگار ہم آہنگ
بلند حوصلہ ہوں، میں بھلا رہوں دل تنگ
ارے یہ ہمدمی "نوحہ خواں" و "زمزمہ سنج"
مجھے ہے اب بھی وہی امتیازِ عشرت ورنج
گدا کی طرح شہنشہ بھی خاک کا پیوند
ہوا کرے، مجھے کیا۔ میرے حوصلے ہیں بلند
کھنڈر محل جہانگیر بن گیا، بن جائے
شرر ستارہ تعبیر بن گیا، بن جائے

اپریل ۱۹۴۷ء

نئی بات کونسی ہے

بپھر جاتی ہے طوفانی فضا۔ ایسا بھی ہوتا ہے
سنور جاتی ہے موجِ بد نما۔ ایسا بھی ہوتا ہے
ڈبو دیتا ہے کشتی ناخدا۔ ایسا بھی ہوتا ہے
بچا لیتی ہے کشتی خود ہوا۔ ایسا بھی ہوتا ہے
نہ پوچھو دیکھ کر حیرت سے کیا ایسا بھی ہوتا ہے
ہوا جو کچھ بھی سب اچھا ہوا ایسا بھی ہوتا ہے
گماں ہے قدر دانی پر کبھی نا قدر دانی کا
یقیں نا مہربانی پر کبھی ہے مہربانی کا
گلا دم بھر میں گھونٹا ہے اجل نے پہلوانی کا
کیا صحت نے استقبال، اکثر نیم جانی کا
دوا سے بڑھ کے ملتی ہے شفا۔ ایسا بھی ہوتا ہے
شفا سے منہ چھپاتی ہے دوا۔ ایسا بھی ہوتا ہے
فقط کیفیتِ تاجِ گرانمایہ ہی کیا جانی
تہی دامانیٔ کشکول کی بھی قدر پہچانی
غمِ کشکول بھی فانی نشاطِ تاج بھی فانی
نہیں کرتے مبصر اعتبارِ تاجِ سلطانی
گدا کو تاجِ سلطانی ملا۔ ایسا بھی ہوتا ہے
لیا سلطان نے کشکولِ گدا۔ ایسا بھی ہوتا ہے

صبا کے سرد جھونکے پڑھتے ہیں برفاب پر منتر
میں دیکھوں آتشِ سیّال کی رو خاک اے حرص!
مگر اس عارضی تقویٰ پہ مجھ کو ناز ہو کیوں کر
نہ یہ ظرفِ وضو محکم نہ یہ پیمانہ محکم تر
چلا "سرشار ہو کر" پارسا — ایسا بھی ہوتا ہے
بڑھا "میخوار" بن کر مقتدا — ایسا بھی ہوتا ہے

جولائی ۱۹۴۹ء

انتقامی جذبہ

زرپرستوں کی ہے دُنیا، یہ سمجھتا ہوں میں
زرپرستوں سے یہاں پھر بھی اُلجھتا ہوں میں
کیا کہوں کتنا خطرناک ہے میرا یہ چلن
"دلِ من داند و من دانم و داند دلِ من"
زرپرستوں سے جدا چونکہ روش ہے میری
اس لیے جانِ مرے دل کی تپش ہے میری
میں نہیں چاہتا بالجبر حکومت کرنا
میں نہیں چاہتا "دامانِ خیانت" بھرنا
میری حسرت یہ نہیں میں چلوں سب کے آگے
سب کے آگے وہ چلے سب سے جو اوّل بھاگے
سر بکف میں ہوں دمِ معرکۂ آزادی

شبیر ہوں، شبیر کی ہر چال ہے سیدھی سادھی
کون کہتا ہے مرے ساتھ رہیں خدمت گار
کب کہا میں نے مجھے لوگ پکاریں سرکار
میری خواہش یہ نہیں ہے کہ باندازِ قدیم
دست بستہ مرے اطراف ہوں استادہ ندیم
آرزو یہ بھی نہیں ہے کہ بنوں میں نواب
میری نظروں میں تو نواب ہے خود نقش برآب
طمطراقِ امراء میں نے دکھایا ہی نہیں
قوم کو لوٹ کے جینا مجھے آیا ہی نہیں
اپنا ذاتی کوئی گھر ہو، یہ ہوس بھی نہ رہی
میں کرایہ کے مکاں میں ہی رہوں یونہی سہی
زر پرستوں نے یہاں مجھ کو ہی کیا لوٹ لیا
جو شریف ان کو ملا اس کا مکاں صاف کیا
جب کسی معتبر انساں کو کہیں پاتی ہے
آتشِ حرص و ہوا ان کی بھڑک جاتی ہے
دیکھ کر ان کی اس آتش نگتی کا عالم
ہے مرے غیظ و غضب کا بھی سنہرا عالم
کم نہیں دل کی حرارت بخدا ہے سو ہے
چاہتا ہوں، وہی فطرت کا تقاضا جو ہے
در بہ در خاک بسر جن کی بدولت ہوں میں
در بہ در خاک بسر ان کو بھی خود دیکھوں میں

جون ۱۹۴۵ء

سکۂ رائج الوقت

(۱)

عتاب سہہ گئے ہے گریاں غریب کا فرزند — خطاب پا کے ہے شاداں امیر کا دلبند
محاذِ جنگ پہ کام آ رہے ہیں فاقہ زدہ — صدائے چنگ پہ لہرا رہے ہیں دولتمند
"فقیر بخش" با اہل و عیال مردہ باد — "امیر خاں" معِ کنبہ بہ عافیت باشند

(۲)

عجب مذاق ہے محبوب کون؟ شوخ و شریر — نیا خیال ہے معتوب کون؟ زار و نژند
غریب کے لئے "دوزخ سرشت" کلبۂ تار — امیر کے لئے "رشکِ بہشت" کاخِ بلند
غریب شخص خود اپنی ہی جھونپڑی میں ملول — امیر فرد پرائے مکان میں خورسند

(۳)

درِ یگانۂ عظمت امیر کا حصّہ — درِ خزانۂ عزّت غریب کے لئے بند
ملا امیر کو عہدہ تو سکھ ملا دُگنا — ہوا غریب ملازم تو دکھ ہوا دہ چند
امیر لوگ بہر حال تازہ دم آزاد — غریب قوم بہر طور خستہ جاں پابند

(۴)

غریب کے لئے رنج و ملال و جُرعۂ آب — امیر کے لئے عیش و سرور و شربتِ قند
رُخِ امیر شگفتہ گلاب کی صورت — دلِ غریب فسردہ کباب کی مانند
امیر فرد کی پوشاک میں شکن بھی نہیں — غریب شخص کے دامن میں پانچ چھ پیوند

(۵)

امیر کے لئے پیہم نئے سے نئے آرام — غریب کے لئے ہر دم طرح طرح کے گزند

غضب ہے اب بھی نہیں برق ریز تیری نگاہ ستم ہے اب بھی نہیں گرد خیز تیرا سمند
قرار و ضبط اسی ایک رنگ پر تا کے سکون و صبر اسی ایک ڈھنگ پر تا چند
"زمانہ با تو نسازد، تو با زمانہ بساز"
تغیراتِ زمانہ ہیں انقلاب پسند

جون ۱۹۴۷ء

بھوک — بھیک

کیا چیز ہے سوندی روٹی سب کہتے ہیں روٹی روٹی
سائل فقرا روٹی کے قائل امرا روٹی کے
روٹی ہے بظاہر چھوٹی سب کچھ ہے، مگر یہ روٹی
روٹی کا اکھیڑا پیدا مجموعۂ دوش و فردا
امروز بھی اس کا شیدا ہیں اس کی حدیں ناپیدا
روٹی کے جہاں جلوے ہوں شورش ہو نہ واں بلوے ہوں
روٹی جو چکا دے جھگڑے جھگڑے ہوں نہ باہم رگڑے
ہر ایک سماجی فتنا ہو جائے نہ سرکش اتنا
پروا نہیں اس کی کس کو دو دل طعن فقط مفلس کو؟
روٹی کی ہے دنیا طالب ہر چیز پہ روٹی غالب
جو شخص نہ پائے روٹی
منزل ہوا اسی کی کھوٹی
کیوں دیکھ رہا ہے تو یوں جاسوس نہیں، رہرو ہوں

دھن علم کی لے نکلی تھی — غایت یہ سیاحت کی تھی
دل خواستہ چیزیں لائیں — نایاب کتابیں پائیں
دیکھی ہے بہارِ عرفاں — نظروں میں ہے کلی پاکستاں
گھوم آیا ہوں گوشہ گوشہ — باقی نہ رہا کچھ توشہ
رکھ کر یہ ذخیرہ بس میں — کیوں کھاؤں میں جھوٹی قسمیں
اس نخل کے زیرِ سایہ — آرام بہت کچھ پایا
تا چند یہ "مردہ راحت" — چلنے کی نہیں ہے طاقت
رہنے دے "ذخیرہ" میرا — ہے اس کے سوا سب تیرا
یہ دیگچیاں یہ لوٹا — سامان، یہ چھوٹا موٹا

موجود ہے سب کچھ لے لے
دے ایک ہی روٹی ڈبے

جنوری ۱۹۴۲ء

شریفانہ بے نیازی

(۱)

خوش بخت ہیں "پیر خاں" کے تایا — سب تاک رہے ہیں ان کا سایہ
دہلیز بھی سربلند ان کی
دنیا ہے نیازمند ان کی
دھیان ان کا مجھے کبھی نہ آیا — سکھ اپنے ہی گھر میں میں نے پایا

(۲)

زردار ہیں "شیخ جی" کے ماموں　　خاص ان کا ہے ادج روز افزوں
زر خیز ہے ان کا آستانہ
مایل ادھر اب ہے اک زمانہ
کیوں بوالہوسوں کا ساتھ میں دوں　　کیا خاک یہ آستانہ چوموں

(۳)

خود "گنجِ رداں" ہیں میرے بھائی　　یا کانِ زر ان کے ہاتھ آئی
بھائی میرے لکھ پتی ہیں چاروں
ملتے ہیں روپے انھیں ہزاروں
دی کب کسی بھائی کی دہائی　　کب ان کی طرف نظر اٹھائی

(۴)

احباب نے کرو فر دکھایا　　میں نے انھیں "فخریہ" سنایا
راس آگیا تم کو ہیں جو تپنا
چھوڑا نہ کبھی مقام اپنا
کب دستِ سوال ادھر بڑھایا　　کس وقت گدا کا سوانگ لایا

(۵)

ہمدرس رہا ہے وہ بہادر　　مانا جسے سب نے "بے بہادر"
اب بھی ہیں امیر دوست ایسے
بے لوث ہوں بھائی بھائی جیسے
ظاہر نہ ہوا کبھی تفاخر　　ہے رازِ خلوص بس یہی گر

(۶)

ہر حال میں بے نیاز رہنا   اپنے لئے کچھ کبھی نہ کہنا
لا ریب یہی طریق اچھا
بے شبہ یہی رفیق سچا
سیکھا ہے جو اپنی رو میں بہنا   آیا غم بے زری کا سہنا

(۷)

سچوں کی ہوئی یہاں جو دُرگت   ابرار نے اس کی دی شہادت
عیار کریں گے میری نیچ کیا
پر دان چڑھے کا میرا سچ کیا
میں تھام کے دامنِ صداقت   بیٹھا رہوں زہ بکف! یہ تہمت!!

(۸)

دل میرا جہانِ پاک بازی   آئے مجھے کیا زمانہ سازی
کہہ ہی نہ سکے گا کوئی انساں
تجھ پر یہ کیا ہے میں نے احساں
اے دوست! بہ شرطِ دلگدازی   اک چیز ہے میری بے نیازی

جنوری ۱۹۴۷ء

عالمانہ بے نیازی

میں ہوں بحر العلوم میں ہوں   ہر سمت ہے جس کی دھوم میں ہوں
چرچا مرا کابل و عرب میں   شہرت مری تونس و حلب میں
زینت دہِ مسند سلف ہوں   روشن کُنِ جادۂ خلف ہوں

Jammu & Kashmir University Library,
Accession No. C 8123

اصحابِ خرد مرے ثنا خواں — اربابِ نظر ہیں مجھ پہ حیراں
مقصد مرا حق کی ترجمانی — میں شارحِ وحیِ آسمانی

"کلکِ قلمم دریں شبِ تار"
"بس معنیِ خفتہ کرد بیدار"

میری نظر و خرد کی حجّت — آمیزشِ مذہب و سیاست
ہے خسرو علم مجھ سے راضی — مفتی ہوں کبھی کبھی میں قاضی
پکی مری دھن ہے میں ہوں بے لاگ — ہے قوم کی میرے ہاتھ میں باگ
سلطاں مرے خوشہ چیں پہ حیراں — شاہی، مری درس گہ سے لرزاں
یکساں مرا باطن اور ظاہر — ہوں میں ہی علومِ دیں کا ماہر

"پیوندِ زمینیاں گسستم"
"نزدیک بآسماں نشستم"

شہرت نہیں پائی میں نے ارزاں — ہر دشمنِ شرع مجھ سے لرزاں
مغرور کا میں نے کفر توڑا — اس ہاتھ میں درہ اس میں کوڑا
سرکش مرا نام سن کے جھک جائے — رہرو مجھے دیکھ لے تو رک جائے
ہے گرچہ مرا لباس میلا — چرچا مرا پھر بھی خوب پھیلا
آرائشِ تن کے غم سے ہوں دور — آسائشِ جاں ہے مجھ کو منظور

"از دولتِ علم سرفرازم"
"وز مال و منال بے نیازم"

جنوری ۱۹۴۷ء

عارفانہ شان

بساطِ عارف   نشانِ ایماں
نشاطِ عارف   زبانِ ایقاں
نکاتِ عارف   بیانِ احساں
صفاتِ عارف   جہانِ عرفاں

دراس کا ملجائے ماہ و انجم   رخ اس کا نور سواد "مردم"
تمام آفاق اس میں ہے گم   بساطِ عارف نشانِ ایماں

بنایا اس نے   "مجاہدۃ النفس"
مٹایا اس نے   غم تجسس
سرورِ عارف   شعور گستر
شعورِ عارف   سرور پرور

خطا سے اس کا عمل مبرّا   گھر اس کا ظلمت سے ہے مبرّا
دیارِ نور اس کا ذرّہ ذرّہ   نشاطِ عارف زبانِ ایقاں

نہ اسم اس کا   اثر ہے خالی
نہ جسم اس کا   خم سفالی
جہانِ معنی   شہود اس کا
حسیں ہے یعنی   وجود اس کا

قدم ہیں اس کے رہِ ہدیٰ پر   یہ رد ہے کیوں جنس گم شدہ پر
نظر ہے اس کی فقط خدا پر   نکاتِ عارف بیانِ احساں

ہے اس کا ماننا　　رضائے مولا
بہ ظاہر احسن　　بہ باطن ادنیٰ
نہ فکرِ فردا　　نہ ذکرِ ماضی
رہا ہمیشہ　　رضا پہ راضی
متاعِ عارف رضائے حق ہے　　سماعِ عارف ثنائے حق ہے
شعاعِ عارف ضیائے حق ہے　　صفاتِ عارف جہانِ احساں

جنوری ۱۹۴۹ء

پاکیزہ کردار

جو میری حقیقت سے ہیں بے خبر　　وہ حیران ہیں میرے افلاس پر
مگر مجھ سے واقف ہیں بالغ نظر
میں بحرِ شرف کا ہوں روشن گہر
نہیں گرچہ کپڑے مرے زرق برق　　مری شان میں پھر بھی آیا نہ فرق
شرافت کے جوہر ہیں تابندہ تر
ادب میرا کرتے ہیں سب خوش سیر
نہ موجود باندی نہ حاضر غلام　　کیا وقت پر خود ہی ہر ایک کام
کہاں میں کہاں ظاہری کر و فر
امیروں کا میں نے لیا کب اثر
جو کنبہ ہے میرا بہت ہی بڑا　　میں پانی کا لایا گھڑے پہ گھڑا
کنکھیوں سے ہر دن سرِ رہگذر

مجھے دیکھتے ہیں حقیقت نگر

ثبوتِ شرافت ہمیشہ دیا میں سینے سے سودا خریدا کیا

فرائض سے اپنے نہیں بے خبر

جھکے پھر ندامت سے کیوں میرا سر

رہا دور ذہنیتِ عام سے میں خوش ہوں کہ میرے کسی کام سے

نہ پہونچا مری شخصیت کو ضرر

نہ بدلوں گا اپنی روش عمر بھر

نہ سردار ہوں میں نہ زردار ہوں صداقت سے لیکن خبردار ہوں

تو نہیں جھوٹ کا میرے دل میں گزر

بنایا ہے سچ نے مجھے معتبر

مجھے قرض لینے کی عادت نہیں مگر وقت پڑ جائے تو ہے یقیں

نہ پھرنا پڑے گا مجھے در بہ در

میں دیکھوں گا اپنی دعا کا اثر

بسر زندگی کر رہا ہوں یونہیں مکاں تک بھی رہنے کو ذاتی نہیں

طوالت ہے بے سود، المختصر

نہیں وجہِ ذلت کرایہ کا گھر

غیرت سوز

جام پر جام ہردم چڑھاتا رہوں — شمع سے شمع پیہم جلاتا رہوں
صبح سے شام تک لہلہاتا رہوں — شام سے صبح تک جگمگاتا رہوں

دامنِ طور میں گنگناتا رہوں
وادیٔ نور میں مسکراتا رہوں

میں زمان و مکاں کا نہیں پاسباں — بندشِ این و آں میری حد میں کہاں
چھوڑ دوں کیوں نہ پابندیٔ این و آں — توڑ دوں کیوں نہ قیدِ زمان و مکاں

میں تقیّد سے دامن بچاتا رہوں
نورِ مطلق سے ہی لَو لگاتا رہوں

بے دلی، بے خودی اصطلاحات ہیں — اصطلاحات ہیں یا خرافات ہیں
یہ خرافات ہیں یا روایات ہیں — یہ روایات ہیں یا حجابات ہیں

ان حجابات کو میں اٹھاتا رہوں
شان ہر آن اپنی دکھاتا رہوں

مل گئی مجھ کو نادانیوں کی سزا — خود شناسی کی اب پا رہا ہوں جزا
غیر کا وہم برسوں رہا جانگزا — خود پرستی کا اب لے رہا ہوں مزا

خود پرستی کی لذّت میں پاتا رہوں
خود شناسی کے جوہر دکھاتا رہوں

کر دیا نقشِ باطل کو میں نے فنا — بڑھ گیا اور بھی اعتبارِ "انا"
اپنی دنیا میں کی میں نے اپنی ثنا — "قالِ ظاہر" نہیں "حالِ باطن" بنا

شان اپنے انا کی دکھاتا رہوں
آپ ہی رنگ اپنا جماتا رہوں
یوں کلیسا میں جاکر کبھی ارمغاں صومعہ مجھ کو سمجھے کبھی راز داں
مسجدوں میں کبھی میں بنوں خطبہ خواں مندروں میں کبھی جاکے دیدوں اذاں
عینیت کے مناظر دکھاتا رہوں
غیریت کے منادر کو ڈھاتا رہوں
کو بکو سو بہ سو گھومتا جاؤں میں گھوم کر اپنے مرکز پہ آجاؤں میں
برملا آڈں میں برملا جاؤں میں یوں خدا کی خدائی پہ چھاجاؤں میں
اپنے زیر اشارہ ان کو لاتا رہوں
جام توحید جن کو پلاتا رہوں
اپنے ہاتھوں امنگوں کو دفنائے جو غیر کا گیت وہ مردہ دل گائے تو
کوئی حیرت نہیں لیکن اے شعلہ خو یہ گوارا نہیں مجھ شرربار کو
خرمنِ غیریت کو جلاتا رہوں
میں تو ہر حال میں جگمگاتا رہوں

بات میں بات

ہر گلکدہ نیچر کی خوش بو سے مہکتا ہے ہر مزرعہ نیچر کے دامن میں لہکتا ہے
گاتی ہے صبا غزلیں نیچر کے سوا کس کی معمور لطافت ہے ہر صنف لطیف اس کی
بہتے ہوئے دریا کیا خاموش ہی بہتے ہیں بہتے ہیں تو نیچر کے کچھ راز بھی کہتے ہیں
گل پیرہنوں پر بھی نیچر کا تصرف ہے ہے ہے یہ جمالستاں جو پھول ہے یوسف ہے

نغمے سے جو یہ گنبد سے ہنستے ہیں جولوں میں
کیا ان کو بھی نیچر نے پالا نہیں جھولوں میں

پھولوں کو نسیم ایسے جھولوں میں جھلاتی ہے
تخئیل ہی سے حسن کی نیند اب مجھے آتی ہے

گلشن ہی کے پھولوں میں نیچر کی جھلک ہے کیا
نیچر ہی کا جلوہ ہے تاروں کی چمک ہے کیا

جھرمٹ میں ستاروں کے جو نہ ہے کمربستہ
چاند آئے گا لینے کو اس جور سے گلدستہ

دروازہ پہ سورج کے کب چاند نے دستک دی
سورج کی تپش نے ہی کیا چاند کو ٹھنڈک دی

ہے چاند بھی نیچر کا سورج بھی ہے نیچر کا
نیچر کے مظاہر بھی ہیں حسن فزا کیا کیا

(۲)

نیچر ہی کے دامن سے وابستہ ہے شہرت
بے کیف نہیں ہوتا یہ عالم کیفیت

چلتی ہے مری دنیا نیچر کے اشاروں پہ
احساس شگفتہ ہے فی الحال بہاروں پہ

نیچر میں ہوں میں بھی گم یہ گمشدگی میری
اے تابع فنکاراں محتاج نہیں تیری

جو کچھ بھی میں لیتا ہوں نیچر ہی سے لیتا ہوں
داد اپنے عطیہ پہ نیچر ہی کو دیتا ہوں

ہے سب سے بڑی مجھ میں اے دوست یہی خوبی
تقلید نہیں کرتا دنیا میں کسی کی بھی

اشعار مرے بالکل نیچر کے مطابق ہیں
"لفظاً بھی موافق ہیں معناً بھی موافق ہیں"

تو مجھ پہ تنتنا ہے، نیچر پہ نظر میری
ہاں ہاں ترے رستہ سے ہے راہ جدا میری

آتا ہے تجھے مجھ پر کیوں رشک خدا جانے
کیا مجھ میں وہ جوہر ہے تو جس کو بھلا جانے

آگاہ میں ہوں اس سے جو تیرا اتہیہ ہے
یہ لطف سخن یکسر قدرت کا عطیہ ہے

قدرت کے عطیہ کو اے بوالہوس یکتا
تو چھین نہیں سکتا میں بیچ نہیں سکتا

جولائی ۱۹۴۵ء

میٹھے ٹھگ

کر دی جنھوں نے ظاہر اپنوں سے بے نیازی
وہ بھی جتا رہے ہیں اب اپنی پاک بازی
عصرِ جدید کیا ہے؟ عہدِ ریا طرازی!
ہے فن کی حیثیت سے رائج زمانہ سازی
ان دہریوں سے کرتا کیوں کر نہیں کنارا
مہر و وفا کی رسمیں ہیں جن کو ناگوارا
داتا شریف داتا کہتے چلے ہیں جھٹ پٹ
آقا عزیز آقا ہر آن ہے یہی رٹ
کیوں کھیلتی نہ ان کے چہروں پہ مسکراہٹ
ہے جلبِ منفعت کا راز ان کی ہر بناوٹ
دلواتی ہے انھیں زر ان کی زمانہ سازی
ہیں خوگر خوشامد مصروفِ "دل نوازی"
ظالم دکھا رہے ہیں اس شان کا تحمل
غیظ و غضب سے گویا نا آشنا ہیں بالکل
بے جا خوشامدوں سے دیتے نہیں کسے جل
جُل دے کے ڈھونڈتے ہیں یہ حلقۂ گُل و مُل
سامانِ عیش و عشرت کرتے ہیں یوں فراہم
طومار باندھتے ہیں کذب و ریا کا باہم

بے سود بیٹھ کرتے کیوں شکل اعتراضی
مفتی ہے ان کے بس ہیں ان کے اثر میں قاضی
حال ان سے بن رہا ہے چینیوں کا عہد ماضی
ہر شخص کو یہ بیٹھے ٹھگ کر رہے ہیں راضی
غم خوار بن کے جنکو دیتے رہے دلاسے
لیتے ہیں جان اسی کی عبرت فزا ادا سے

فروری ۱۹۴۶ء

غاصبانہ روش

(۱)

یہ کون ہے؟ مرزا دارا — کیا ہے یہ وہی مہ پارا!!
تھا جان جو سب کنبہ کی — گھر جس پہ فدا تھا سارا

(۲)

یاد اس کا ہے بچپن مجھ کو — وہ اس کا نیا گھوارا
شکل اس کی وہ بھولی بھالی — ڈھب اس کا وہ پیارا پیارا

(۳)

مشکل سے اسے پہچانا — اب اور ہے کچھ نظّارا
پوشاک دریدہ ردّی — ملبوسِ کہن ناکارا

(۴)

سرمازدہ یہ سیمیں تن — شان اس کی ہے پارا پارا

گردش میں ستارے اس کے لرزاں یہ حسیں سیارا!

(۵)

میں جانتا ہوں یہ لڑکا آنکھوں کا ہے کس کی تارا
نواب ضمیر الدولہ سلطان رئیس ولشکر آرا

(۶)

مانوس تھا ان کے گھر سے اوجِ علم و نقارا
بعد ان کے "ہلاکو خاں" نے ہر چیز پہ چھاپا مارا

(۷)

ہم زلف مزے یوں لوٹے اولاد ہو یوں آدارا
اے چشمِ دُر افشاں ہمت کیا اس کے سوا ہے چارا

شاعرانہ بے نیازی

مربوط ہیں اجتہاد و ایجاد
مضبوط ہے شاعرانہ بنیاد
میں پیش کردوں جو اپنی روداد خوش چشمیٔ نکتہ بیں کرے صاد
چرچا مری شاعری کا گھر گھر
پیدا مرے شاعرانہ جوہر
پنہاں مری دولتِ خداداد خوش مجھ سے مبصرین دلشاد
تنویرِ نگاہ گنج در گنج

محتاج مرے کئی سخن سنج
شاگرد مرے بہت چمن زاد	کیوں آئے مرے چمن میں صیّاد

یہ خطّہ صبا کا مرکزِ طوف
ہر قسم کی یورشوں سے بے خوف
ہر طرح کی بندشوں سے آزاد	ہر نوع کے مُطربوں سے آباد

روشن مری بزم درس آموز
ذرّے مرے گھر کے مہر افروز
پُرنور مرا جہانِ ارشاد	نیچر کا ہوں میں مطیع و منقاد

کرتا نہیں میں کسی کی تقلید
ہر شرخیٔ تازہ لائق دید
کرتی ہیں یہ جدّتیں مجھے شاد	وابستہ مجھی سے میری ایجاد

"محسودِ زمانۂ خود استم"
"بایں ہمہ رندِ مے پرستم"
یہ بھی تو نہیں ہے اب مجھے یاد	کیا ہے مرے دشمنوں کی تعداد

ہاں، عارفِ حال مست ہوں میں
ہاں، شاعرِ خود پرست ہوں میں
خوش ذوق کو میرے شعر ہیں یاد	دیں گے مجھے بدمذاق کیا داد

اعدا کا ہجوم فوج در فوج
یا نقش بر آب موج در موج
یا صورت گردباد برباد	کچھ بھی سہی — تاکجا یہ افراد

اعدا سے نباہتا نہیں ہیں
بالفعل ہوں کیف آفریں ہیں

کس دل سے اٹھاؤں میں یہ افتاد اشرار کی داد بھی ہے بے داد
اشرار کی ہر "شرر فشانی"
بھڑکی رہی میرے آگے پانی

ہیں ان سے خجل جو سست بنیاد کھولیں گے وہی زبانِ فریاد
اے دوست سکونِ دل کا ساماں
ہے خسرو رح دہلوی کا فرماں

"گر کس نکند ز آفریں شاد من خود کنم آفریں خود باد"

رسمی پرستش؟ ؟ ۔۔۔ توبہ

(۱)

کوئی ارماں نہیں کوئی خواہش نہیں فکرِ بخشش نہیں خوفِ پرسش نہیں
ترسِ ظلمت نہیں شوقِ تابش نہیں میرے شام و سحر نذرِ سازش نہیں
میرا مفہوم بے ہودہ کاوش نہیں
میرا مقصود بے سود کوشش نہیں
حاصلِ بت پرستی نمائش نہیں رسمِ دیرینہ ہے یہ پرستش نہیں

(۲)

سچ ہے، عرفانِ بت رقت انگیز ہے رقت انگیز عرفاں طرب ریز ہے

یہ طرب ریزِ عرفاں جنوں خیز ہے — یہ جنوں خیز عرفاں حق آمیز ہے
بت شناسی بھی معنًا بڑی چیز ہے
بت پرستی فقط وجہِ نازش نہیں
حاصلِ بت پرستی نمائش نہیں — رسمِ دیرینہ ہے یہ پرستش نہیں

(۳)

دانش آموز میرے لئے کل جہاں — بینش افروز میرے لئے ہر سماں
عشرت اندوز ہر دم نہیں میں کہاں — تازہ دم تھا وہاں زندہ دل ہوں یہاں
میرا بت میرے آگے ہے جاؤں جہاں
نا اہلِ بت کدہ ذوقِ بینش نہیں
حاصلِ بت پرستی نمائش نہیں — رسمِ دیرینہ ہے یہ پرستش نہیں

(۴)

کب مجھے یاد ہستی کا ہے ماجرا — اور کیا کیف و مستی کا ہے مقتضا
جاں فزا میری ہستی کی ہے ابتدا — حق رہی بت پرستی کی ہے انتہا
فلسفہ بت پرستی کا سمجھے وہ کیا
جس کا دل محرمِ کیفِ دانش نہیں
حاصلِ بت پرستی نمائش نہیں — رسمِ دیرینہ ہے یہ پرستش نہیں

(۵)

من کے مندر میں کس کس کی سیوا کروں — بس یہی ایک جلوہ میں دیکھا کروں
مقصدِ آفرینش کو پورا کروں — یہ عبادت ہے اس کے سوا کیا کروں
اپنے ہی دل نشیں بت کی پوجا کروں

یہی ارماں ہے کچھ اور خواہش نہیں

حاصلِ بت پرستی نمائش نہیں رسمِ دیرینہ ہے یہ پرستش نہیں

(۶)

کیا خبر حد کدھر قعرِ پستی کی ہے اب شکایت کسے تنگدستی کی ہے
دھوم ہر سو مری جلوہ مستی کی ہے میرے لب میں ضیا مہرِ ہستی کی ہے
بت پرستی بنا حق پرستی کی ہے
کیا مرے بت کی مجھ پر نوازش نہیں
حاصل بت پرستی نمائش نہیں رسمِ دیرینہ ہے یہ پرستش نہیں

(۷)

میرے دل کی جلا اس کی ہر شان ہے غیر سے کب مری جان پہچان ہے
کون اس کے سوا جان کی جان ہے اور کس میں مرارات دن دھیان ہے
دھیان جس کا مرا جز و ایمان ہے
وہ حسیں بت برائے نمائش نہیں
حاصلِ بت پرستی نمائش نہیں رسمِ دیرینہ ہے یہ پرستش نہیں

(۸)

مہرباں آیئے بیٹھے دیکھیے جھلملانے لگے آسماں کے دیے
میں نے ایسے چراغ آج روشن کیے جنکے جلووں میں سب مست ہیں بے پیے
بت پرستوں کا میں ساتھ دوں کس لیے
مجھ کو منظور رسمی پرستش نہیں
حاصلِ بت پرستی نمائش نہیں رسمِ دیرینہ ہے یہ پرستش نہیں

خاکی پُر نور

معمورۂ حق تنگ نہ پائے عُرفا لنگ
ضد ہے عُرفا کی بخدا جاہلِ بے ننگ

شخصیتِ انساں کا گھٹے وزن قمر سے!
خورشید خود اس کی عظمت کا نہیں پاسنگ

بے آب ہو انساں کی نظر تاب گہر سے!
خود لعل کا جچتا نظر آتا نہیں یاں رنگ

معصوم ملک رمزِ اطاعت کے ہیں جو یا
معصوم کو معلوم ہو کیوں گردشِ جنگ

مثلِ ملک انسان بھی معصوم ہے گویا
ایسا نہیں ۔۔۔ معلوم اسے جنگ کے ہیں ڈھنگ

حیثیتِ دُہلِ جنگ ہے اعلانِ عداوت
اظہار محبت کا ہے آوازۂ دف و چنگ

گنجینۂ راز اس کا ہمیشہ بہ حفاظت
آئینہ دل اس کا بہرحال بلا زنگ

الزام اسے دیتے ہیں ملک سنگ دلی کا
سرنامۂ دارین ہے نام اس کا بہر رنگ

کرتے ہیں گماں اس پہ فلک تنگ دلی کا
سرمایۂ کونین ہے انسان کا "دلِ تنگ"

راز اس کی نیابت کا نہ اموال نہ افواج
بھید اس کی خلافت کا نہ دیہیم نہ اورنگ
خوش دانش و فرہنگ سے ہے سب کا یہ سراج
سرِ عظمت کیا ہے؟ فقط دانش و فرہنگ
ناسوت "فضائے ملکوتی" سے ہم آہنگ!
ہوں خاکی پُر نور یہ نوری تُمر خاد تنگ!

تنویر دماغ

(۱)

صولتِ غزنوی نہیں خوشش رخِ ایاز ہیں
عیب یہی ہے اے وطن تیرے بھی نکتہ ساز ہیں
عیب و ہنر کا تذکرہ کرتے زبان راز ہیں
فاش حقیقتِ نہاں کی ہے رہِ مجاز ہیں

(۲)

قوم بقا طلب کرے تفرقۂ غلام و حُر
آمر قوم کی جگہ حسن نے ہمیشہ کی ہے پُر
آئے کہاں سے حریت بندۂ فتنہ باز ہیں
دل تو ہے اس کا مطمئن دامنِ حرص دراز ہیں

(۳)

حُسن سے غُلام کی ادا باہمہ فرق مل گئی
مجھ سے مگر چھپے گا کیا۔ چال تو ہے نئی نئی
کیوں نہ مری خلش بڑھے منظر عجیب و ناز میں
خیر کی جستجو کہاں؟ شر کدۂ مجاز میں!

(۴)

شر کدۂ مجاز میں فرد حقیقت آشنا
میرے سوا کوئی نہیں مرد حقیقت آشنا!
رہ گئی میری آبرو دیدۂ امتیاز میں
غیر سے دور ہوں کہ ہے مصلحت احتراز میں

اگست ۱۹۴۱ء

جاہلانہ بے نیازی

باشندہ یہ شخص گاؤں کا ہے
دیہات میں عمر کاٹتا ہے
بر میں ہے وہی کثیف کرتا
جو عید کے دن پہن لیا تھا
کاندھے پہ وہی پرانا کمبل
لایا تھا جو چار سال اوّل
ہے نیم برہنگی کا عادی
اس کی حرکات سیدھی سادی
مکھی گر جائے چھاچھ میں تو
انگلی سے نکال کر یہ خوش ہو
ہے یہ بھی دلیلِ عقل گویا
سایہ میں شجر کے جا کے سو یا
بیلوں کی طرف چلا ہے اٹھ کر
کھیتی کی زمیں ہے اور ناگر

ہے قابلِ رحم یہ جفاکش — کرتے ہیں مبصّر اس پہ عش عش
واقف نہیں عزّ و جاہ سے یہ — ڈرتا نہیں بادشاہ سے یہ
یہ نابلدِ رہِ سیاست — رکھتا ہے بس اس قدر فراست
سانپ آئے نظر تو مار دینا — دم سانپ میں ہو تو بھانپ لینا
چمکارنا ایسی بکریوں کو — ہیبت زدہ بھیڑیئے سے ہیں جو
راتوں کو جو سردیوں میں دکھ پائے — چقماق جھڑا کے آگ سلگائے
کیا جانے یہ شہر کا سلیقہ — ہے گاؤں کا اور ہی طریقہ
میں نے اسے شہر میں بلایا — جلوہ اسے شہر کا دکھایا
اب تک بھی گنوارپن وہی ہے — خو بو وہی اپنے گاؤں کی ہے
واعظ کو جو واعظ کہتے دیکھا — دوزخ کا فرشتہ اس کو سمجھا
حالانکہ وہ دندنا رہا تھا — دوزخ کا سماں دکھا رہا تھا
کورا ہو جو واعظوں کے ڈھب سے — کیا ربط بھلا اسے ادب سے
میں خاص غزل پہ سر دھنوں تو — گھورے بڑی دیر تک یہ مجھکو
چہرے سے عیاں ہے اس کا احساس — یہ شعر کو جانتا ہے بکواس
شاعر ہے کوئی تو ہو اسے کیا — وہ شعر پڑھے گا یہ ہنسے گا
عالم، واعظ، ادیب، شاعر — القصہ ہیں جتنے بھی اکابر
سب اس کی نظر میں خار و خس ہیں — ناداں ہیں غبی ہیں بوالہوس ہیں
بیلوں کو جو باندھے اپنے گھر میں — کیا فرق ہے اس میں جانور میں
چپ چاپ چلے جو پیٹ بھرتا — وہ پست خیال کیا ابھرتا
ناواقفِ کارزارِ ہستی — کیا دیکھ سکے گا اپنی پستی

حالاتِ سکندر و ارسطو ۔۔۔ دیں اس کو ہنسی کا خاص پہلو
سقراط کا تذکرہ جب آئے ۔۔۔ ہنستے ہنستے یہ لوٹ جائے
راز اس کا ابھی کھلا نہ اس پر ۔۔۔ ہنستا ہے یہ اپنی دھن میں کس پر
عادت ہے اسے چنیں چناں کی ۔۔۔ کیا قدر گدھے کو زعفراں کی
دیکھے کوئی جاہلانہ انداز ۔۔۔ خوبی نہیں کچھ بھی ... ناز ہی ناز

ہے کوئی بھی وجہ سرفرازی
کس بات پہ اتنی بے نیازی

جنوری ۱۹۴۴ء

نفی و اثبات

مُنعم بدسیر بدسیر میں نہیں
علم و فضل و ہنر حلم و صبر و یقیں

کس صفت سے ہے پُرنور تیری جبیں ۔۔۔ کن محاسن نے تجھ کو بنایا حسیں
بد کے آگے ہے کیا؟ بدتر و بدتریں ۔۔۔ طے بہرحال سب منزلیں تو نے کیں

تو کہیں خشمگیں خشم پرور کہیں
مُنعم بدسیر بدسیر میں نہیں
مُنعم خوش عمل خوش عمل میں یقیں ہوں
آج کل آج کل یونہی کب تک کہوں

دشمنِ قوم کا آمرانہ جنوں ۔۔۔ آئے دن دمبدم ہو رہا ہے فزوں
آج ہی کیوں نہ کر دیں اسے سرنگوں ۔۔۔ تو مرا ساتھ دے میں ترا ساتھ دوں

حق کی خاطر جیوں حق کی خاطر مروں
منعمِ خوش عمل خوش عمل میں بھی ہوں
مُطربِ خوش نوا خوش نوا میں نہیں
پیشۂ ناروا اور وجد آفریں!

چند سکوں پہ اے دشمنِ عقل و دیں
تو نے کیفیتیں اپنی قرباں کیں
داغ اس طرح چمکے تری جبیں
پھر بھی آنکھیں تری کیوں نہیں شرمگیں

خیر تو نازنیں ہے تو خوش رہ یونہیں
مُطربِ خوش نوا خوش نوا میں نہیں
مُطربِ سحر فن سحر فن میں بھی ہوں
میرا کیفِ سخن روحِ شعر و فسوں

تو جگا اپنا جادو اے دوست یوں
دشمنانِ وطن روک دیں گشت و خوں
میں بھی چلتا ہوا ایسا منتر چلوں
دور ہو جائے اعدا کا جس سے فسوں

داد میں تجھ کو دوں داد میں تجھ سے لوں
مُطربِ سحر فن سحر فن میں بھی ہوں
قایدِ قوم کُش قوم کُش میں نہیں
قوم ہے تجھ سے خوش یا ہے اندوہگیں

فیصلہ تو ہی کر کیوں ہے چیں بر جبیں
کیا یہ طرزِ بیاں ہے ملال آفریں
اس پہ ہے قہرِ ستم اس پہ شمشیرِ کیں
پھٹ گیا بم کہیں کٹ گیا سر کہیں

قوم کیسے بھی جیں ہوں اسیر و زبوں!
قایدِ قوم کُش قوم کُش میں نہیں

Jammu & Kashmir University Library
Accession No. 68123

قاید تیز رو تیز رو میں بھی ہوں
اپنے دل کی یہ ضو عام کیوں کر نہ دوں
سر و پابستہ ہوں کیا جو ٹھیرا رہوں — شیخ دل خستہ ہوں کیا جو پیہم چلوں
ذوقِ گفتار سے ہوں ناشناسِ جنوں — شوق رفتار نا آشنائے سکوں
راہِ حق پر چلوں اور آگے بڑھوں
قاید تیز رو تیز رو میں بھی ہوں

مفتیٔ شاہ رس شاہ رس میں نہیں
تیرا جوش ہوس رخنہ انداز دیں
رنگ فتوے کا ہے گہہ چناں گہہ چنیں — تیرے حسن رقم سے ہے فتوا حسیں
شاد تجھ سے خداوند تاج و نگیں — دیں فروش اور آدابِ شرعِ مبیں!
واہ، علم الیقیں آہ، حق الیقیں
مفتیٔ شاہ رس شاہ رس میں نہیں

مفتیٔ تازہ دم تازہ دم میں بھی ہوں
ظالموں کا ستم پھر بھی کب تک سہوں
دوست آتا چند میں اپنا غصہ پیوں — بھائی! کس وقت تک جبر دل پر کروں
قوم کا حال ہو اور گستاخیوں — دندناتا ہوا کیوں نہ آگے بڑھوں
مرد میدان ہوں کیسے پیچھے ہٹوں
مفتیٔ تازہ دم تازہ دم میں بھی ہوں

واعظِ زرطلب زرطلب میں نہیں
تیرا لطف و کرم توبہ توبہ ہر کہیں

مل گیا زر جہاں جم گیا تو وہیں
ہائے اللہ یہ مصرفِ علم و دیں
میری باتوں سے تو کیوں ہے اندوہگیں
اپنی باتوں کو میں ختم کر دوں یہیں

میری مسند زمیں تو ہے منبر نشیں
واعظِ زر طلب زر طلب میں نہیں
واعظِ حق نما حق نما میں بھی ہوں
فکرِ ظلِّ ہُما ذکرِ دنیائے دوں

مَیں کروں؟ توبہ توبہ بھلا میں کروں
مَیں تو مَیں قوم کو بھی اجازت نہ دوں
فکر ایسی بُری ذکر ایسا زبوں
اپنے باطل شکن عزم سے کام لوں

بات سچی کہوں راہ سیدھی چلوں
واعظِ حق نما حق نما میں بھی ہوں

اپریل سنہ ۱۹۴۹ء

حفاظتِ ضمیر

مطلب ہے میرا تاجِ کیانی؟ نہیں نہیں
مقصد ہے میرا باج ستانی؟ نہیں نہیں
مسلک ہے میرا عشرتِ آنی؟ نہیں نہیں
مشرب ہے میرا دولتِ فانی؟ نہیں نہیں

میں ہاں میں ہاں ملاؤں کسی کی غلط غلط
میری تو آرزو ہے "حقیقت رسی" فقط

بے فکر ہے مآل سے رندِ قدح بدست
بے خوف ہے زوال سے مستِ مئے الست
گھبرائے ان سے کیوں وہ ہے کون حال مست
شرمائے ان سے پیچھے کون حق پرست

ذی علم جانتے ہیں کہ مَیں حق پرست ہوں

خوش فہم مانتے ہیں کہ میں چال مست ہوں

مجھ کو عزیز خاطر احباب ہے مگر
کب تک؟ مرا ضمیر ہے جب تک عروج پر

ثابت جو ہوں ضمیر کُش احباب مدبر
ہو جاؤں خوش میں رشتۂ محبت کا توڑ کر

ہو فائدہ ضمیر کُشوں سے بھلا مجھے!
ہیش سراب خاک مری تشنگی بجھے!

دوں اپنے دل پہ کیوں میں عزیزوں کو اختیار
مرغوب کیا نہیں مجھے اپنی صلاح کار

ناراض ہوں عزیز تو ہو جائیں لاکھ بار
حق کو میں ان پہ کر نہیں سکتا کبھی نثار

خوش مجھ سے وہ نہیں ہیں تو رنجیدہ میں نہیں
حق دوست ہوں کسی کا بھی گرویدہ میں نہیں۔

اپریل ۱۹۴۷ء

کیف دیدہ وری

اُٹھتا ہی پھروں اتنا سبکسار نہیں میں
جاسے نہ ہلوں ایسا گرانبار نہیں میں

آزادی کامل ہے نہ پابندی کامل
ان دونوں حدوں میں مری حد ہے خطِ فاصل

ہمرنگ ہوں لینن کا نہ ہٹلر کا ہم آہنگ
فطرت کے مقابل میں کروں کیا ہوس جنگ

اوروں کی طرح میں نہیں لے دوست سخن ساز
انسانگی ترے دل میں مرے دل کی یہ آواز

دھوکا ترا کھاؤں نہیں سرشار میں ایسا
زد میں تجھے لاؤں نہیں عیار میں ایسا

مفلس نہیں اتنا بھی کہ احباب سے لوں قرض
منعم نہیں ایسا بھی کہ اغیار کو دوں قرض

ہے میری نظر وقت شناس و محل آگاہ
رہتا ہے زمانہ کا تغیر مرے ہمراہ

نادر کا فسانہ نہ رنگیلے کا ترانہ
میری تو ہے روداد عمل معتدلانہ

آباد ہے گھر۔ خانہ بدوشوں میں رہوں کیا
آزاد ہے دل۔ بادہ فروشوں سے ملوں کیا

واعظ سے ہے ناراض مری ہمتِ عالی
منبر ہی پہ معراج ہو! یہ پست خیالی

اسلاف کی تحقیق میں مفتی کو نہیں شک
ہے یاد اسے "مقتِ کرم داشتن" اب تک

سیکھی ہی نہیں مجتہدانہ روش اس نے
اس کو تو یہی یاد ہے کیا لکھ دیا کس نے

مفتی کے سبق میں کوئی جدت ہی نہیں ہے
واعظ کا بھی آموختہ نامحرمِ دیں ہے

قائل ہوں میں اب اپنی ہی بالغ نظری کا
قرآں سے مجھے درس ملا دیدہ وری کا

مارچ ۱۹۲۳ء

دامِ ضمائر اور نگاہِ شاعر!

پھیلاؤں جو میں روشنیٔ دیدۂ بینا
تفہیمِ انا البرق کرے تابشِ مینا

ہو جاؤں اگر مدعیٔ کشفِ حقیقت
کھل جائیں سرِ میکدہ پیرانِ طریقت

سمجھا دوں اگر برق فگن حسن کی باتیں
جل جائیں ابھی عکس پرستوں کی قنائیں

بیٹھا نہیں ہیں دامِ ضمائر میں الجھ کر
کی سیرِ گلستاں کی گلستاں کو سمجھ کر

آنکھیں ہوئیں جب بادۂ عشرت سے نشیلی
گلزار میں سرشار نظر آئی چنبیلی

جب تک نہ شگفتہ ہوئی خود دل کی فراست
سمجھا نہ سکا مجھ کو گلاب اپنی لطافت

چشمِ اثر اندوز و دلِ ولولہ آگیں
یہ دونوں سلامت ہیں تو پر کیف ہر آئیں

پیاری نہیں چمپا ہی یہ گیندا بھی ہے پیارا
سلمیٰ وش و یوسف نظر یکساں ہیں دل آرا

کیوں مجھ سے خفا ہو کوئی پیارا کہ پیاری
برگشتہ کسی سے نہیں خوبی کا پجاری

کتنے چمن افروز ہیں نرگس ہو کہ لالہ
پڑتا ہے مرے دیدہ و دل پر بھی اجالا

رنجش نہیں کچھ دامنی و رنگ گلچیں میں — ہیں دونوں حسیں دائرہ خوش نگہی میں
دلچسپ نہیں حور ہی غلماں بھی ہیں دلکش — ہر جلوہ حسنِ ازلی پر ہے نظر بخش
خوش با دلی سے ہے مری پاک نگاہی — دے گا مرا ظاہر مرے باطن پہ گواہی
پوجا مجھے کرنا ہے کسی ایک حسیں کی — تخصیص نہیں ماہوش و زہرہ جبیں کی

مقصد ہے مرا حسن کے جلووں کو سمجھنا
منظور نہیں دام ضمائر میں الجھنا

مئی ۱۹۳۹ء

فرق زمین و آسماں خودکُشی و نفس کُشی میں ہے

اس میں فنا کی تلخیاں اس میں بقا کی سرخوشی
نفس کُشی نہ آ سکی تحتِ شعورِ خودکُشی

نفس کُشی کا مدعا کیف و کمِ طرب اثر
مقصد خودکُشی ہے کیا؟ ترکِ نشاطِ ماحضر

شوقِ حیات مستقل نفس کُشی کے ہمعناں
حسرتِ مرگِ منفعل ہمرہ خودکُشی رواں

نفس کُشی سے معتبر پاک دل آدمی بنے
مائل خودکُشی ہوئے تنگ خیال سرغنے

نفس کُشی مآل ہے عقل دقیقہ سنج کا
اور نتیجہ خودکُشی فرطِ جنون و رنج کا

فرق زمین و آسماں خودکُشی و نفس کُشی میں ہے

نغمہ ہے اس کا جانفزا روح گُسل ہے اس کی لے
گھوم رہے ہیں نفس کُش منزلِ مہر و ماہ میں

مجرمِ خودکُشی نہاں ہو گئے قعرِ چاہ میں
عقل ہے دنگ دیکھ کر نفس کُشوں کا دبدبہ

سوچئے خودکُشوں کا ہے دہر میں جو بھی مرتبہ
نفس کُشوں نے حل کیا مسئلۂ خدارسی

کرتے ہیں خودکُش آپ ہی شرحِ ہلالِ بیکسی
دیتے ہیں زور نفس کُش اپنی نگاہداشت پر

مجرمِ خودکُشی تو ہیں رازِ بقا سے بے خبر
نفس کُشوں کا حوصلہ اہلِ اوجِ مکرمت

ولولہ خودکُشوں کا ہے سائلِ قعرِ منقصت
زندہ دلانِ نفس کُش عظمتِ رفتہ پائیں گے
مُرتکبانِ خودکُشی قبر سے کیا پھر آئیں گے؟

مارچ ۱۹۴۲ء

قطب از جانی جنید

(۱)

بچاؤ جان، نہ لو ساتھ کوئی چیز، چلو
قریب آ گئے دشمن، چلو، عزیز! چلو
نہیں، ندیم! انہیں، میں نہیں ہوں پست خیال
ہٹو یہاں سے — کرو تم عدو کا استقبال
عزیز! خوب سہی یہ بھی "خیر مقدم" کی
وہی مذاق، وہی دل لگی، وہی دھمکی

(۲)

چلو عزیز! چلو کچھ تو دل کو بہلائیں
جلوس "قیصرِ اعظم" کا دیکھنے جائیں

کروں یقین میں اڑتی سی اس خبر پہ خاک
ندیم! "قیصرِ مردہ" کی اب تلک اتنی دھاک

عزیز بھائی! تمہیں کد ہے "قیصریت" سے
وگرنہ کیا وہ یہاں آرہا ہے تربت سے

(۳)

عزیز! "پیرمن شاہ" کا ہے عرس شریف
چلو سماع کی محفل میں ۔۔۔ ہے سماں بھی لطیف

ندیم بھائی! شرافت کی بھی ہے کوئی حد
شریف "عرس" "شریف" "آستاں" "شریف" "لحد"

زباں سے لفظ نکالا ادھر ادھر اصلاح
عزیز کیوں نہیں کہتے نہیں سماع مباح

(۴)

عزیز حضرتِ دل ہیں بہت ہی خوش آدا
مشاعرہ میں جگر بھی دکھائیں گے اعجاز

مشاعرہ میں بڑے دل بڑے جگر کا ہے کام
ندیم! جاؤ تمہیں میر اندر سے سلام

عجیب شخص ہیں یہ نہیں کوئی بات بھی منظور
عزیز بھائی! یہی قطبیت کے ہیں دستور!؟

جون ۱۹۵۰ء

ماحول بیزار سخنور سے خطاب

کرنے لگا ہوں میں انہیں گوشوں کو بے نقاب
فنکار پردہ دار ہی خود جن کا ہیں حجاب

معنی کا ہے یہ ڈھنگ کہ ہر شعر اک سراب
صورت کا ہے یہ رنگ کہ پیمانۂ شراب

تشبیہ استعارہ کنایہ مبالغہ
چاروں عناصر ان کا جاتے ہیں رعب داب

تقلید استفادہ اعادہ مظاہرہ
ہیں ان کی "ناظمانہ عمارت" کے چار باب

آہا کب آئے؟ حضرت طاؤس آئیے
پاس آئیے سنائیے کچھ تازہ انتخاب

پتھر نہ پھینکئے ابھی سرکار نہ گائیے
یوں ہی سنا کے نظم ہوا کون کامیاب

کیا خوش نما ہے نظم یہ ہے نظم یا پری
پروین پہ پرن سہیل سہا کہکشاں شہاب

جوزا و سنبلہ و ثریا و مشتری
ہر لفظ میں دبی ہے چمک واہ واہ جناب

تاروں سے آپ کھیلتے ہیں اور کھیلئے
نظموں میں بھی دکھائیے تاروں کی آب و تاب

شاید زمیں ہو گئی تنگ آپ کے لئے
لیکن جناب نظم نگارِ قمر رکاب

منہاج آپ کی نہیں منہاج پرنیاں
ماحول آپ کا نہیں ماحولِ ماہتاب

اوپر ہی اوپر اڑتے پھروگے کہاں کہاں
دیکھے گا کون خاک نشینوں کا اضطراب

مئی ۱۹۵۰ء

واقعیت

خوشی کا دیتے ہیں یوں اشتہار خوش باطن
یہ ہیں بہار کی راتیں یہ ہیں بہار کے دن
پکارتی ہے فضا موسمِ سعید آیا
بہار کرتی ہے اعلان روزِ عید آیا
مزے بہار کے لے میری طرح چاندنی کاش
شب برات کے اسرار چاندنی سے ہوں فاش
سکون و راحتِ جاں صبح و شام خوش نفساں
کہ عطر بیز ہوا ہے مشام خوش نفساں

نشاطِ دیدہ و دل مژدۂ بہار رہی
ہنسے وہ پھول وہ غنچوں کے لب پہ آئی ہنسی

ثمر رسیدہ ہے رندوں کا یوں نہالِ امید
شگفتہ جیسے دمِ دید ہو "حقیقتِ دید"

سرور پاش ہے کس درجہ ابر کیا کہئے
کریں گے تا بہ کجا رند صبر، کیا کہئے

گرج گرج کے فضا ہو گئی سکوت پذیر
کہ طرزِ خاص میں ہنکارتے ہیں ساغر گیر

قدح بدست پھر آئی بہار توبہ شکن
پئیں پلائیں مئے خوشگوار توبہ شکن

زہے طراوتِ موسم خوشا بشارتِ فصل
حقیقت اب ہے غمِ روزگار کی بے اصل

ہوئی ہے جب سے عروسِ بہار جلوہ نما
خود اپنی پردہ دری پہ تلا ہوا ہے ہُما

چمن چمن روشِ "جلوۂ صبا رفتار"
کلی کلی سے نمودار ہے نشاطِ بہار

عزیزو! گلکدہ زردار خاں کا دیکھ آئیں
چلو بہار میں گلگشت کے مزے پائیں

یہ کون راہِ چمن میں ہے ساکت و جامد
ارے، خزاں کا ہے "بہروپ" "سرنگوں شاید"

نہیں بہار کا بھی اس غریب کو کچھ ہوش
خموش ہے یہ شاید۔ نہ جوش ہے نہ خروش
نہیں نہیں یہ ہمیں جیسا ایک انساں ہے
عزیز پوچھ تو لو اس سے کیوں پریشاں ہے
نہ چھیڑیئے مجھے حضرت جفا کشیدہ ہوں میں
ستم رسیدہ الم دیدہ غم چشیدہ ہوں میں
اعزہ خود جسے کر دیں برادری باہر
کریں نگاہِ کرم راہ گیر خاک اس پر
ملول مجھ سے ہیں اپنے پرائے بھی ناخوش
خطا معاف مرا علم ہے جہالت کش
غرض نہیں مجھے افسانوی عقیدوں سے
نہ مرشدوں سے میں راضی نہ خوش مریدوں سے
برادری ہے ابھی شہر پرست دیر پرست
تمام شہر میں دو چار ہوں گے عرفاں مست
"امیر" شاہ بھی دھوکا، "فقیر" شاہ بھی وہم
مگر مرید و رعیت اسی طرح نافہم
حباب ہے "شہر قسم" ان دنوں اے دوست
مگر نگاہ میں اس کی حباب دیم ہمہ اوست
مشائخین و سلاطین اپنے افسانے
سنا رہے ہیں کہ خاموش ہیں خدا جانے

جولائی سنہ ۱۹۵۰ء

سمجھ سکتے ہیں ـــــ کہ نہیں سکتے

بلغ کو آپ سمجھتے ہیں نیستاں ... سمجھیں | زاغ کو آپ یہ سمجھتے ہیں غزلخواں ... سمجھیں
یہ ہے اکسیر "زر اندوز" اسے پارا جانیں | وہ ہے شمشیر "سر انداز" اسے آرا مانیں
دشت کو جانتے ہیں آپ چمن یہ بھی ٹھیک | شہر کو مانتے ہیں آپ بن یہ بھی ٹھیک
آپ مختار ہیں غنچہ کو شرارہ ہی سمجھیں | منع کب میں نے کیا گل کو شرر ہی سمجھیں
نہر ہے بحر! بجا! بحر ہے تالاب درست | بحر بھی نہر کی مانند ہے پایاب!! درست
جگمگاتا ہوا ایوان کھنڈر ہے! ہوگا | لہلہاتا ہوا بستان سقر ہے! ہوگا
آتش شعلہ فشاں باعث رحمت! شاباش | چشمۂ آب رواں موجب زحمت! شاباش
چاند کو آپ سمجھتے ہیں توا! کیا کہنا | زہر کو آپ سمجھتے ہیں دوا! کیا کہنا
خوب! چنگیز ہے "بالطبع" ہمایوں؟! کیا خوب | خوب ضحاک ہے "بالفعل" فریدوں! کیا خوب
آپ شیطان کو چاہیں تو فرشتہ سمجھیں | خیر و شر میں ہے جس انداز کا رشتہ سمجھیں
جو خیال آپ کی حد میں ہے برا، اور! اچھا | سارے خوش فہم سمجھ لیں اسے کیوں کر اچھا
ہاں یہ دریوزہ گر انساں جو بہ ہمسر ہے | تاجدار آپ سمجھتے ہیں اسے!! بہتر ہے
مور کو آپ سلیمان کا ہمسر سمجھیں | بلکہ چاہیں تو سلیمان سے بڑھ کر سمجھیں
جستی دست کو چاند آپ سمجھ سکتے ہیں | بحث چھڑ جائے تو کیا سب سے الجھ سکتے ہیں؟!
میں یہ کہتا ہوں آپ ایسا سمجھنا چھوڑیں | عرض کرتا ہوں کہ یوں مجھ سے الجھنا چھوڑیں
مست ہے اپنے خیالوں میں ہر اک متوالا | آپ کی رائے کو ہیں کون بدلنے والا

سنگ کو لعل سمجھتے ہیں! سمجھ لیں سرکار
لیکن اس کا نہ کریں جوہریوں میں پرچار

جولائی ۱۹۳۷ء

تفریحِ دل

(۱)

سوز درون اثر فزا کیوں نہ ہو میرے ساز میں
شعلہ فشاں بہار ہے دورِ نظر نواز میں
پھول نہیں، شرارہیں دامنِ اہتزاز میں
آتشِ دل بھڑک اٹھی راہِ طرب گداز میں

(۲)

فرقِ نیاز و ناز میں یا کچھ نہیں ہوں عشق میں اب
وارفتۂ نیاز سے ہو گیا دست کش میں اب
خوش ہے وہ ناز آفریں آکے حدِ نیاز میں
نام کو بھی نہیں رہا فرقِ نیاز و ناز میں

(۳)

حسن سبک خرام خود اپنی روش بدل چکا
عشق جہاں بڑھا بڑھا — عشق جہاں رکا رکا
اس کی جلا نشیب میں اس کی ضیا فراز میں
پھر بھی مجھے سکوں نہیں عالمِ سوز و ساز میں

(۴)

چشمِ "زبوں مذاق" میں آہ شگفتہ دل ہوئے ہیں
پیشِ نگاہِ "خوش نظر" آتشِ مشتعل ہوئے ہیں

ڈالی ہے وہم عیش کو نارِ فنا طراز میں
محوِ نشاطِ فکر ہوں خلوتِ "بخت ساز" میں

اگست ۱۹۴۱ء

نشاطِ بہار

خزاں تھی کبھی پردہ دار بہار — بہار اب خزاں کی ہوئی پردہ دار
ازل سے نہیں دونوں بھی ہمکنار — کبھی وہ کبھی یہ ہے بے برگ و بار
خزاں کل بہار اپنی دکھلا گئی
خزاں پر بہار آج پھر چھا گئی

جدا شئے ہے صرصر، بہار اور شئے — اگرچہ کہ دونوں میں اک رشتہ ہے
وہ فریادِ مجنوں کی دل سوز لے — یہ ہے "شیام" کی عشرت اندوز نے
خزاں کے تصور سے دل ہل گیا
بہار آئی — یہ غنچہ خود کھل گیا

بہار و خزاں کے اصولی نقاط — جدا کر چکا ہوں بصد احتیاط
وہ رازِ الم ہے یہ سرِّ نشاط — مگر پھر بھی دونوں میں ہے ارتباط
نہیں ارتباط ان کا مسرور کن
اسی واسطے اب ہے میری یہ دھن

کہ واپس خزاں کو پھر آنے نہ دوں — بہار آ گئی ہے تو جانے نہ دوں
خزاں کو نیا سوانگ لانے نہ دوں — غم انگیز منظر دکھانے نہ دوں
یہ رُت ہے جو سرمایہ دارِ بہار

نظر کے لئے ہو یونہیں خوشگوار

نگاہوں سے اب چھپ چکی ہے خزاں — کہاں ہیں رفیقانِ یکدل کہاں
اٹھا لائیں سب مل کے رطلِ گراں — عنادل گلستاں میں ہیں نغمہ خواں
گلستاں ہے معمورِ گلبانگِ عیش
غضب کا یہ موقع نہ یہ جائے طیش

کرم ساقیٔ بزم آرا! کرم — مسرت کی لہروں میں بہ جائے غم
ترے پاس محفوظ ہے جامِ جم — نکال اب اسے تجھ کو مے کی قسم
بحقِ جم مست کُن، مست کر
مجھے آج پھر جم کا ہمدست کر

بہار اس یقیں کی ہے آئینہ دار — حقیقت ہے جس کی مسرت شعار
سُرورِ حیات و نشاطِ بہار — وہی، ہاں وہی "یک کرشمہ دو کار"
کلی پھول بننے کی خاطر کھلی
شگفتہ ہوئی یوں مری خوش دلی

مرے وردِ لب ہے ثنائے بہار — کہ ہوں میں طرب آشنائے بہار
یہ ارماں ہے اے رونمائے بہار — ملے تیرے ہاتھوں عطائے بہار
میں ہو جاؤں سرشارِ جامِ طرب
نہ چھوڑوں کبھی یہ مقامِ طرب

اکتوبر ۱۹۴۱ء

فرطِ مسرّت

تصور ان کا اتنا میرے احساسات پر چھایا
جدھر دیکھا انھیں کا دلربا جلوہ نظر آیا
اثر اک چیز کے دو مختلف! یہ کیا تماشا ہے
تصور نے ہی دی تسکین تصور نے ہی تڑپایا
مجھے لانا پڑا ایماں تصوّر کی کرامت پر
تصور کی بدولت جو مزا پایا نہ ایسا پایا
اُمید و یاس کی آویزشیں بھی روح پرور ہیں
خدا شاہد ہے میں اس کشمکش میں بھی نہ گھبرایا
بصیرت مطمئن ہے چشمِ دل کی روشنی ہی وہ
بصارت کہہ رہی ہے کیفِ جلوہ میں نے کب پایا
بصارت کا تقاضا آگیا غالب بصیرت پر
محبت نامہ اس کے نام اسی نے مجھ سے لکھوایا
"جواب" آج آئے گا ہر صبح کہتا ۔ شام جب آتی
بڑی حسرت سے کہتا آج بھی قاصد نہیں آیا
نہیں آیا تو بس آہی رہا ہوگا ۔ اب آئے گا
اسی اُمید میں ہفتوں دلِ مضطر کو بہلایا
دلِ مضطر کو بہلانا بہت خوش کُن ہوا ثابت
کہ اس حُسنِ یقیں کا نیک فالی پر پڑا سایہ

صدا جب اپنا خط لے جائیے کی دفعتہً آئی
اسی ساعت سروش غیب نے بھی مژدہ پہنچایا
نکل کر گھر سے دیکھا تو انھیں کا خط نظر آیا
لیا خط اور یہ سمجھا کہ سب کچھ میں نے بھر پایا
لفافہ کانپتے ہاتھوں سے پھر کھولا یہ کہہ کر
مرے خط کا جواب آیا مرے خط کا جواب آیا

مئی ۱۹۴۵ء

شعریت فلسفہ آمیز

دے کے صبا جھونکے پر جھونکا
منہ چومے ہنس مکھ پھولوں کا

کُنہ وہ کیا سمجھے پھولوں کی
مدح سنو مجھ سے پھولوں کی

پھولوں کے جلوے روشن ہیں
پھول لطافت کا مخزن ہیں

پھول حسیں بھی حسن فزا بھی
حسن کے مرکز پر ہیں فدا بھی

خود بھی خوش ہیں پھولوں سے
یہ سنتا ہوں میں پھولوں سے

ایسا ربطِ باہمد یگر
پھر بھی جدا رہتے ہیں اکثر

لاکھ کہے کوئی البیلی
ہائے چنبیلی ہائے چنبیلی

پھول چنبیلی کے نہ ملیں گے
موسم جب آئے گا کھلیں گے

سب پھولوں کا حال یہی ہے
شاید اس کا سرو بھی ہے

پھولوں کی جتنی ہیں قسمیں
جمع ہوئیں سب کس مجلس میں

طور یہی ہے خاص پھلوں کا — دیکھ لیا اخلاص پھلوں کا

سارے میوے ہر موسم میں — آئے نظر کب اس عالم میں

میں نہیں کہتا باغ جناں کی — مجھ کو خبر ہے صرف یہاں کی

جی چاہے سو مل نہیں سکتا — غنچۂ خاطر کھل نہیں سکتا

آم کا موسم سیتا پھل دے! — کیوں نہ کوئی ہنستا ہوا چل دے

ہم جب ان دونوں کو چاہیں — ڈھونڈتی ہی رہ جائیں نگاہیں

سیتا پھل کی ہر اک ڈالی — ہاتھ اپنے دکھلائے گی خالی

ہر میوے کی فصل جدا ہے — فصل جدا ہے اصل جدا ہے

لذتِ دنیا سے ہے ہنگامی — یا ہے یہ میرے ذوق کی خامی؟

کیف سے میں خود ہوں بیگانہ
یا ہے ادھورا نعمت خانہ

مئی ۱۹۴۶ء

کارواں بننے کی ریت

چاند تاروں کی بدولت خوش نما ہے آسماں
میری نظروں میں ہے کل کی رات کا اب تک سماں

چاند تاروں کی جلو میں ہو گیا پھر گامزن
اتنے روشن دل جلو دار! ایسے من بھاتے بچن

کاٹ دیں جو باتوں باتوں میں یہ کالے کالے کوس
کیوں نہ ہوں ان رہرووں کے حوصلے افلاک بوس

کیوں نہ کر دے چاند کو خوش کارواں بننے کی ریت
مشتری دف لے کے آ پہنچے جو زہرہ گائے گیت
اس سفر میں کیوں نہ ہر افسردگی پامال ہو
کارواں کا کارواں جس میں شگفتہ حال ہو
اتحاد ان خوش دلوں کو کیوں نہ کر دے سرخرو
صلح جو آئے نظر مریخ سا بھی جنگ جو
سب شریک کارواں ہیں کیا کوئی آوارہ ہے
لائقِ نظارہ ہر مشعل بکف سیارہ ہے
باندھ کر اپنی کمر جوزا کرے یوں انتظام!
رہروانِ زندہ دل اب بھی نہ ہوں کیا شادکام
راہ تا حدِّ نظر ہموار کر دے کہکشاں
منزلِ مقصود کا ناپید ہو پھر بھی نشاں !
منزلِ مقصود خود ان کے قدم چومے نہ کیوں
گامزن ہیں یکدلی کی حد میں جو روشن دروں
قابلِ تقلید ہے اس قوم یکدل کا سفر
دیکھ اے خاکی! انہیں دل نوریوں کے منتشر
طے سفر کرتا ہے تو راتوں کو تنہا کس لئے
دیں گے قندیلیں تجھے کیا تیری آنکھوں کے "دیئے"
کس کے در پہ سجدہ تو کرتا ہے روزانہ، بتا
ڈھونڈتا رہ یونہی مسجودِ حقیقی کا پتا

تو ہی اپنا مقتدا ہے تو ہی اپنا مقتدی
مطمئن ڈیڑھ اینٹ کی مسجد پہ ہے تیری بدی
تجھ کو مسجودِ حقیقی سے بھلا کیا واسطہ
تُو تو ہے بغض و حسد کا درمیانی رابطہ
جا! تری آوارگی برباد کر دے گی تجھے
میں بھی خاکی ہوں مگر پُر نور ہونا ہے مجھے
خاک چمکے تیرا رخ نورِ صلوٰۃ و صوم سے
تیرا دل بیزار اے تیرہ دروں ہے قوم سے

اپریل ۱۹۵۰ء

تحریصِ عمل

تاریکیٔ شب کا اثر مٹنے لگا ہے اس قدر
نقاش تزئین سحر ہونے لگا ہے، جلوہ گر
وہ حُسن کارِ گلستاں سب اس کی ہیں گلکاریاں
پرتو سے اس کے ضو فشاں شبنم کی گوہر باریاں
عشرت فزا اس سے بنے غنچوں کے دلکش قہقہے
کلفت رُبا اس سے ہوئے چڑیوں کے خوش کن چہچہے
اس کے مئے عرفاں سے ہیں سرشار مہمانِ چمن
ہو ہو کے مست آیا ہوں میں سوئے جوانانِ چمن
یہ نوجوانانِ چمن یہ بے خودی میں جھومنا

خوش رو صبا کا یہ چلن بہ منہ گلوں کا چومنا
اپنی جگہ پر مستیاں کرتا ہے سرو پا بگل

مصروف فریاد و فغاں ہے بلبلِ تفتیدہ دل
ہشیار گلچیں ہی نہیں صیاد بھی ہشیار ہیں

ذوقِ عمل ہے دلنشیں تیار تھے تیار ہیں
کرتے ہیں اپنا کام سب کیا مالنیں کیا باغباں

یکساں نہیں ہے سب کا ڈھب مانا کہ سب ہیں کاروں
ہر دم صفائی کے لئے ہر سو رواں جاروب کش

شانِ صفائی دیکھ کے نظریں ہوئیں آنکھوں میں غش
گلچیں اُدھر بھرنے لگے پھولوں سے اپنی جھولیاں

یاں آبیاری کے لئے ہیں مالنوں کی ٹولیاں
دامن کشِ ارمانِ دل گلگشت رسمی ہی نہ ہو

خوش ایک اسی نظارہ سے اے دوست! تیرا جی نہ ہو
رنگ اور بھی کچھ دیکھ لے تو بھی تو اپنا کام کر

وابستہ اپنے شغل سے ہر شخص آتا ہے نظر

اپریل سنہ ۱۹۲۱ء

مفقود و موجود

(۱)

وہ مجمع وہ پیرِ مغاں ہے کہاں — وہ محفل وہ رطلِ گراں ہے کہاں
یہ دل — یہ نظر — یہ سماں ہائے ہائے — وہ دل — وہ نظر — وہ سماں ہے کہاں

(۲)

کروں کس کی خاطر میں سیرِ چمن — چمن میں وہ سروِ رواں ہے کہاں
بس اے مہرباں ختم کر پرسشیں — بتا دے وہ نامہرباں ہے کہاں

(۳)

ثنا خوانِ ہندوستاں ہیں بہت — بہی خواہِ ہندوستاں ہے کہاں
یہ رسمی ثنا خواں نہ آئیں ادھر — خلوص آفریں خوش بیاں ہے کہاں

(۴)

شعورِ بہار و خزاں مٹ گیا — تمیزِ بہار و خزاں ہے کہاں
متاعِ دلِ شادماں لٹ گئی — نشاطِ دلِ کامراں ہے کہاں

(۵)

عیاں ہے عنادِ دلِ حاضریں — خلوصِ دلِ رفتگاں ہے کہاں
کہاں خانخاناں کہاں مان سنگھ — وہ رسمِ رہِ دوستاں ہے کہاں

(۶)

محبت ہے اور اپنی دنیا میں ہے — بزرگو عزیزو کہاں ہے کہاں
مجازاً تو جنت نشاں ہے یہ باغ — حقیقت میں جنت نشاں ہے کہاں

میں کہتا چلا ہوں رموزِ فلاح
مجھے کیا خبر رمز والا ہے کہاں

فلسفۂ ہست و بود[۱]

بہاروں پہ مَیں حکمراں تھا کبھی — یہاں میرا سکّہ رواں تھا کبھی
یہ گلزار ہے اب جو وقفِ خزاں — مرے حق میں رشکِ جناں تھا کبھی
میں غم آشنا ہو گیا اب تو کیا — سرورِ دلِ دوستاں تھا کبھی
مری قدر کیا خاک سمجھے سموم — صبا کا بھی میں رازداں تھا کبھی
روش میری مستانہ تھی کیونکہ میں — عناں گیرِ سروِ رواں تھا کبھی
وہ سروِ رواں اب ملے گا کہاں — یہاں جو مرا ہمعناں تھا کبھی
بہ دقّت ظواہر سمجھتا ہوں اب — حقائق کا میں ترجماں تھا کبھی
غم انگیز اب ہو گئی اس کی یاد — نشاط آفریں جو سماں تھا کبھی
ترستا ہوں ایک ایک ساغر کو آج — مرے بس میں رطلِ گراں تھا کبھی
اسی باغ میں خاک اڑاتا ہوں اب — اسی باغ میں شادماں تھا کبھی
انھیں کیاریوں میں جو اب خشک ہیں — سکوں بخش آبِ رواں تھا کبھی
کھنڈر بن رہا ہے جو یہ خانہ باغ — یقیناً بہشتی مکاں تھا کبھی
یہ میرا چمن، ہاں یہ میرا وطن — حقیقت میں جنّت نشاں تھا کبھی
چمن میں عدو اب ہے "آتش فشاں" — یہی کیا یہاں گلفشاں تھا کبھی؟!!

سوا اس کے ہے اور کیا انقلاب
عیاں وہ ہوا جو نہاں تھا کبھی

دسمبر ۱۹۴۶ء

۱؎ برطانوی سامراج پر یہ میری آخری نظم ہے۔

تابع مہمل

سیدھا سادا دیس پُجاری سیدھے سادے بول ‎ من کا مندر کھول
ہاں، اے گیانی! ہیں یہ سیدھے سادے بول انمول ‎ رول اب موتی رول
چاندی ملی سونا، مونگا، موتی، جھوٹا سب سنسار ‎ پاپی ہے دربار
مورکھ اس اندھیاری میں یہ چکیلا پر چار ! ‎ وہ بھی سو سو بار
برچھی، بھالا، جمدھر، خنجر اوچھے سب ہتھیار ‎ رکھدے یہ تلوار
تو ان ہتھیاروں کا اب کیوں کرتا ہے بیوپار ‎ مدّھم ہے بازار
سیانڈ کیسا، کس کی کشتی "دنگل ونگل" جھوٹ ‎ دیکھا اس کا سوٹ؟!
بلوانوں میں یہ پردیسی ڈالے گا اب پھوٹ ‎ بستی میں ہے لوٹ
پورب، پچھم، دکّھن، اتّر چاروں کھونٹ اپنے ‎ ہم آئے تپنے
آجا اپنے درشن کرنے نام اپنا جپنے ‎ دیکھ اچھے سپنے
نیند اُچٹ جاتی ہے جس سے کب تک اس کا دھیان ‎ ٹھیک نہیں اوسان
گیان اپنا کر، دھیان اپنا رکھ، آپ اپنے کو جان ‎ کہنا میرا مان
تیری نگری تیرا راجا، ناتا اس سے جوڑ ‎ اوروں سے منہ موڑ
من کا مندر پُوجنے والے "دیول" "ویول" چھوڑ ‎ توڑ ایسے بُت توڑ

اپریل ۱۹۴۲ء

عشرتِ آزادی

واہ اس گُلکدہ کی یہ خوش منظری دل لبھانے لگی باغ کی سبزی

خوب اس میکدہ کی یہ جاں پروری رنگ لانے لگی جام کی دلبری

عالمِ رنگ و بو کی یہ تازہ ہوا ایکشی ہے روا شاد ہیں خوش نوا

ساقیٔ دلربا اور یاد آوری واہ وا واہ وا واہ وا واہ وا

دل کشا یہ جو قدرت کی تائید ہے عیشِ جاوید ہے روحِ امید ہے

خضرِ میخانۂ قدس کی رہبری لائق دید ہے مژدۂ عید ہے

غاصبانِ سبک سر کا ہی بھرم ہو گیا کالعدم ہیں وہ اب خستہ دم

جاں ہماری قوی دل ہمارا جری خاص موقف میں ہم ہو گئے محترم

ہم ہیں بندِ غلامی سے آزاد اب تھے کبھی جاں بلب وقفِ رنج و تعب

ختم ہو کر رہا دورِ غارت گری یہ ہے عہدِ طرب شاد ہیں سب کے سب

لا سکے گا نہ واپس یہ چرخ کہن دورِ شورہ دفتن عہدِ رنج و محن

رنج و غم سے جدا شور و شر سے بری اب ہیں سب مرد و زن پاسبانِ وطن

بن گیا پھر چمن اپنا جنت نشاں پھر غنا دل یہاں ہو گئے "شعر خواں"

منعقد پھر ہے بزمِ سخن گستری کھل گئی پھر زباں — کون ہے سرگراں

ہاں، یہ طرزِ سخن میری ایجاد ہے غم سے آزاد ہے "عشرت آباد" ہے

دوست ڈالیں نہ اس پر نظر سرسری لائق داد ہے قابلِ صاد ہے

اگست ۱۹۴۷ء

غلطہائے مضامیں مت پوچھ

ان کا خط اور میں کہوں!! املا غلط انشا غلط
ہیں صحیح الفاظ وعدہ کے مگر وعدہ غلط
نقشبندانِ سیاست کا نوشتہ دیکھ کر
میں تو کہہ سکتا نہیں اتنا صحیح اتنا غلط
دل میں ہے کچھ اور کہتے ہیں زباں سے وہ کچھ اور
سچ نہیں ہے یہ تو پھر دنیا کو میں سمجھا غلط
بندہ پرورا کیا خیر کس سحر فن کا ہے یہ کام
میں تڑپ اٹھا صحیح ـ آپ ہی نے تڑپایا غلط
علم مستقبل نہیں اب تک تو ہوں زندہ ضمیر
اپنے دل کی ترجمانی میں نہیں کرتا غلط
رازِ طاعت، خدمتِ خلقِ خدا، لاریب فیہ
قبل ازیں مفہومِ طاعت میں جو سمجھا تھا غلط
امراء القیسی عروض از براتھیں ہو بھی تو کیا
میر کے اشعار تک پڑھتے ہیں مولینا غلط
فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن
یہ ڈھب اردو شعر کی تقطیع کرنے کا غلط
مٹ گئے ہم مٹ گئے ہم مٹ گئے ہم مٹ گئے
وزن یوں جانچیں جو ہم ہندی تو کیا ہو گا غلط

اپنی بھٹی اپنا ساقی اپنا ساغر اپنی مے
مے ادھر کی ہو تو ان اپنوں پہ اترانا غلط
شاعرانہ ذوق نے موقع پہ رکھ لی میری لاج
میرے بھائی نے تو قومی گیت بھی گایا غلط
ہیں علی منظور بھی شاعر یہ کہنا کچھ صحیح
ہیں علی منظور بھی استاد ـــ یہ دعویٰ غلط

اکتوبر ۱۹۴۷ء

باحیا باوقار و بے حیا بے وقار

پا رہے ہیں عزۂ وجد جوانانِ چمن
گا رہے ہیں وطنی گیت محبانِ چمن
یہ "چمن دوست" ان افراد سے رکھتے ہیں عناد
غیر سے ہیں جو مدد خواہ بہ وقت امداد
غیر کو اپنے چمن میں جو بلا لیتے ہیں
بے حیا ہی انھیں جینے کی دعا دیتے ہیں
خویش و بیگانہ میں تفریق جو کرتے ہی نہیں
باحیا لوگ کبھی ایسوں پہ مرتے ہی نہیں
غیر جس باغ سے محفوظ ہو وہ جل جائے
غیر کیوں ان کی ریاضت سے بھلا پھل جائے
ان کے چہرے سے عیاں ہے عصبیت ان کی

طالب رحم نہیں غیر سے غیرت ان کی
باغ میں آئیں بہاریں کہ جُھلس کر رہ جائے
چاہتے ہیں کہ حمیت پہ کبھی آنچ نہ آنے
غیر کی سیر کو اپنوں نے گوارا نہ کیا
پھول تو پھول ہیں کانٹوں کو بھی چُھونے نہ دیا
غیر تو غیر ہی تھا، غیر کو اپناتے کیوں
عمر بھر زندہ ضمیروں سے یہ شرماتے کیوں
بل میں بل اپنا بل اغیار کا بل جائے جل
منتظر وقت کے ہیں ان کا ارادہ ہے اٹل
غیر کو دیکھ سکیں، یہ نہیں فطرت ان کی
اور کچھ چاہتی ہے اب تو حمیت ان کی
صولتِ زندہ ضمیری کبھی کھلادیں گے
کیا ہے غیرت کا تقاضا اسے سمجھادیں گے
پختہ جو لوگ کئے جاتے ہیں اپنی دھن کو
داغ یہ شعر سناتے نظر آئے ان کو
"شرکتِ غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری"
"غیر کی ہو کے رہے یا شبِ فرقت میری"

ڈسمبر ۱۹۲۵ء

اپنے دیہاتی بھائی سے

ٹھکرائیں یونہی نابجا میری پند آپ — کب تک کریں مشاہدۂ زہر خند آپ
دیکھیں کبھی تو کارگہِ نقش بند آپ — سمجھیں کبھی تو غایتِ پست و بلند آپ

حق اپنا مانگتے ہیں اگر حق پسند آپ
کہئے میں عقل مند ہوں یا عقلمند آپ

موقع ملا تو کر کے رہا اجتہاد میں — عصری ضروریات سے ہوں بامراد میں
کرتا نہیں تمدّنِ ماضی کو یاد میں — رہتا ہوں اپنے شہر میں شاد اور شاد میں

جیتے ہیں اپنے گاؤں میں نزار و نژند آپ
کہئے میں عقل مند ہوں یا عقلمند آپ

آرام جو ہے شہر میں وہ گاؤں میں کہاں — بجلی کی روشنی سے ہے نورانی کل جہاں
سوکھا جواب آپ کو دے دے اگر کنواں — خورشید کو دکھاؤگے کیا خشکیِ زباں

میں چین سے ہوں، جھیل رہے ہیں گزند آپ
کہئے میں عقل مند ہوں یا عقلمند آپ

راتوں کو آپ گھر سے نکل کر تو دیکھئے — جگنو ہی لے کے آئیں گے بجھتے ہوئے دیئے
برعکس اس کے شہر کا نظارہ کیجئے — تاباں ہیں "برق پاش" ستارے مرے لئے

جدّت پسند میں ہوں قدامت پسند آپ
کہئے میں عقل مند ہوں یا عقل مند آپ

کیوں، بھائی یاد آپ کو ہیں ضابطے بھی کچھ — قانون مانتا ہے حقوق آپ کے بھی کچھ
کچھ سعی کیجئے تو گورنمنٹ دے بھی کچھ — موقع پہ لیجئے مدد احباب سے بھی کچھ

باہر ہوں میں قفس کے، قفس میں ہیں بند آپ
کہیے میں عقل مند ہوں یا عقل مند آپ

لائن یوں بدلتے ہیں

س

تاروں سے خجل کیوں تری آنکھیں ہیں بباطن
آنکھیں تری تاروں کی ہی مانند نہیں کیا

ج

ہاں ہاں مری آنکھیں بھی ہیں پُر نور دلیکن
ہیں اس کرۂ تار میں پابند نہیں کیا

س

محوِ گلِ صد برگ رہے تو یونہیں کب تک
تیرے لئے لقمان کی "صد پند" نہیں کیا

ج

لقمان کی صد پند دل افروز ہے بے شک
پھولوں کے بھی دمساز خردمند نہیں کیا

س

جھینپی ہوئی نرگس ہے مگر سرو ہے طنّاز
باہم گر ان میں کوئی پیوند نہیں کیا

ج

آزاد اگر "سرد خراماں" ہیں نہ کر ناز

"نرگس" ابھی گلشن میں نظر بند نہیں کیا

س

شاخوں کو سجاتے ہیں نہالانِ چمن ۔ دیکھ

تو مائلِ زیبائشِ فرزند نہیں کیا

ج

تو شانِ چمن دیکھ چکا ــــ اب کوئی "بن" دیکھ

مجھ سے ہی فلاکت زدہ دہچند نہیں کیا

س

فرعون سے ظالم کو خداوند ــــ کہے کون

تو مدحتِ فرعون سے خورسند نہیں کیا

ج

فرعون بڑی چیز ہے ــــ فرعون تو فرعون

تیرے لئے "ہاماں" بھی خداوند نہیں کیا

س

سُن سُن کے "نہیں کیا" نہ بنا منہ مرے ہمدم

ان تلخ پھلوں میں مزۂ قند نہیں کیا

لائن بدل دی

مشتاق ہوں میں ــــ ہاں، دہی گھڑی دہی اسرگم

کیوں دوست! تجھے یاد کوئی "چھند" نہیں کیا

جون ۱۹۵۲ء

کایا پلٹ

پاپ کی نیا کھینے والا سنیاسی جگ بیت گیا
سورج بنسی بازی ہارا اور ہریجن جیت گیا
بھارت ماتا سب کی ماتا بالک اس کے سب بالک
پُتر ہیں سورج بنسی ہی کیا اور ہریجن ہے پالک
یہ بھی میرا وہ بھی میرا کہنے والے آج کہاں
جن کی گودی میں پلتا تھا پاپ وہ بے بد مہاراج کہاں
کیسی رانی کیسا راجا رانی راجا کچھ بھی نہیں
راج محل سنسان پڑا ہے باجا گاجا کچھ بھی نہیں
پہرا چوکی کچھ بھی نہیں ہے روشن چوکی گاتی کیوں
جب نہیں رانی چھیل چھبیلی تالی جھانجھ بجاتی کیوں
راجاجی کا سوگ مناتے ہیں اب اوندھے نقارے
اچپ سادھے بیٹھے ہیں یہ آج کسی ڈر کے مارے
کس بلی اپنا سونپ کے جن کو ہنی تھی بھارت ماتا
ان کو جو گوں مارنے والے کہلاتے تھے ان داتا
ایسے ان داتا اب گھر گھر مارے مارے پھرتے ہیں
جب نہیں ملتا کوئی سہارا ٹھوکریں کھا کر گرتے ہیں
ہنس ہنس کر آکاش کے تارے دیکھ رہے ہیں اب یہ سمے
پالو اکھڑ جائیں جن کے یوں کیوں کر ان کا رنگ جمے

نیچ اور اونچ کے بندھن کو تھا توڑنے والا جو چکر
اونچے اونچے لوگوں کو بھی لے آیا اپنے ڈھب پر
کب تک ہوتی سورج بنسی اور ہریجن میں یہ جھڑپ
لے آئی ہے ان سب کو پھر اک پنگھٹ پر دل کی تڑپ
چلتی ایسے جوت بھرے پنگھٹ پر کس کی ہٹ دھرمی
گنگا جل کے رسیا ہو کر کیوں کرتے "کھٹ کھٹ دھرمی"
کھٹ کھٹ اگلی اب نہیں ان میں گیت رسیلے گاتے ہیں
بن کے پریمی بھائی بھائی پریم کا پھل پاتے ہیں
من بھاتے بھائی چارے نے چھاؤں جو ڈالی ہے ان پر
سورج بنسی سکھ پاتے ہیں ساتھ ہریجن کے رہ کر

ستمبر ۱۹۴۸ء

صرف فسانہ

یہ قلعۂ شاہی یہ محلات یہ باغات
طغرائے ملوکیت کسریٰ طرب آیات
باغوں نے دکھائے ہیں جنت کے نمونے
اسرار طرب فاش کئے جوشِ "نمو" نے
یہ وقت یہ منظر یہ فضا طیر خوش الحاں
کیا نہر کی رفتار ہے! کیا عیش فراواں
انوار مسرت کدہ پریوں کے پرے ہیں
سکے ہیں رواں عیش کے جتنے بھی کھرے ہیں
یہ ساغرِ گلرنگ یہ انسان پری وش
مے کا وہ کھلا رنگ ہے آنکھوں میں نظر غش

ہے عیش ہی عیش اور مسرت ہی مسرت
دنیا شہِ خوش دل کیلئے بن گئی جنت

نوروز کا دربار نئے ڈھنگ، نئے رنگ
ذوقِ شہِ خوش دل پہ ہیں اصحابِ نظر دنگ

دربار میں لایا گیا اک فدوئ ناچیز
"نذرانۂ ناچیز" ہے کیا؟ دخترِ نوخیز

تنویرِ نظر بنتی ہے مہ پارۂ خوش بخت
کرتا ہے شہ وقت عطا اسکو بھی اک تخت

ہے تخت نشیں بوریہ پر بیٹھنے والی
گھیرے ہوئے ہیں اس کو اہالی و موالی

شاہی کا کرشمہ شہِ خوش دل نے دکھایا
اس کو ملکہ اور اسے نواب بنایا

ہیں آج صدف جنگ بہادر وہ صدف بیگ
کل موتیوں کے وہم میں جو چھانتے تھے ریگ

نوروز گیا۔ خیر سے عید بقر آئی
نواب نے دربار میں پھر پائی رسائی

اس وقت صدف جنگ بہادر نہیں ناچیز
نذرانۂ دلچسپ؟ وہی حسنِ دل آویز

یہ تحفہ ہے اس ہدیۂ مرغوب سے بڑھ کر
ہے عمر میں کمتر تو وجاہت میں فزوں تر

شاہانہ تقرب سے ملا ان کو عروج اور
داخل امرا میں ہیں بہر حال بہر طور

وہ دور گیا۔ ہوں گے کسی وقت یہ نداف
لرزاں ہے انہیں دیکھ کے لب شاہ کا اسراف

نواب کے قبضہ میں خزانے بھی گئے ہیں
اعزاز بڑھا۔ محترم الدولہ بنے ہیں

ہے درخورِ تعریف سماں سالگرہ کا
ارمان کسی دل میں ہے خوشنودئ شہ کا

وہ محترم الدولہ صدف جنگ بہادر
دریائے ذہانت کے ہیں جو بیش بہا دُر

دربار میں آتے ہیں بصد اوج بصد جاہ
ملتی ہے انہیں حبذا نگاہِ کرم شاہ

نذرانہ اسی ڈھب کا۔ جو مرغوب ہے شہ کا
مستی کے بھی عالم میں دماغ ان کا نہ بہکا

انسان کو بتایا ہے یہ بھی سالگرہ نے
پیمانۂ اندازہ یہ تھا کب یہ سمجھنے

دل اب کے جو آگے سے بھی کچھ بڑھ کے لبھایا

شہہ نے انھیں نواب اثر الملک بنایا

کیسے اثر الملک ہیں اخلاق ہیں کیسے — دو سال کی مدت میں خطابات بھی لیے!
اُمید ہے سیرت کا رہا گر یہی خاکا — مل جائے خطاب ان کو شریف الامرا کا
اصلی ملکہ چھپ گئی ظاہر ہیں کنیزیں — داماد و خسر دونوں بھی خاصے کی ہیں چیزیں
طالب نہیں تفصیل کا اجمال طلب دور — اس خسرِ خوش دل کے خسر ہونگے بہت اور
سنتا ہوں کہ یہ پست نظر پست نہیں ہیں — دیکھوں نہ کے ہوا خواہ ہوادار نشیں ہیں

شہدوں کا زمانہ یہ لفنگوں کا زمانہ
بننے کو ہے تاریخ، نہیں صرف فسانہ

جنوری سنہ ۱۹۵۰ء

شانتی

دکھاتا ہے یہ چرخِ نیلوفری — ہزاروں برس سے وہی سیتری
عطارد وہی ہے، وہی مشتری — وہی زہرہ و مہ کی جلوہ گری

نہ مریخ کے نو بہ نو طور ہیں
نہ کیواں کے ہی رنگ ڈھنگ اور ہیں

نئی ہے ابھی یہ قدیم انجمن — ہر اجلاس ہے اس کا تابش فگن
وہی صدرِ ذی قدر کا بانکپن — اراکین کا بھی وہی ہے چلن

وہی ہے سبھا ٹھاٹھ سارے وہی
وہی ہے فضا چاند تارے وہی

جماعت کا جز ہر اولوالعزم ہے — وہی ساز و سامان وہی بزم ہے

مفید ان کا ہر عزم بالجزم ہے　　انھیں کیا خبر کیا بلا رزم ہے
تباہی سے کیا ربط اس بزم کو
نہ پہچانے جو صورتِ رزم کو

زمیں کی روش اس کے برعکس ہے　　لبھاتی ہے دل "جنگنا" کی لے
کدورت بڑھاتی ہے تخریب سے　　شرارت بھاتی ہے تاثیرِ نے
نشاط آفریں جامِ سرِ جدال ؟!
محبت فزا نغمہ رانِ ملال ؟!

نہ یاں بزم ویسی نہ پایندگی　　نہ یاں صدر ویسا نہ تابندگی
وہ لاکھوں برس اور وہ زندگی　　یہ عمریں ہماری یہ شرمندگی
کہاں ہم کہاں وہ حیاتِ دوام
نہ قایدہی زیرک نہ عاقل عوام

زمیں پر جو چمکے سیاست کے چاند　　دکھاتے تھے تاروں کو وہ کو دپھاند
نہ سمجھے کبھی غایتِ بود و ماند　　اسی واسطے ہو گئے جلد "ماند"
سرِ بزم جو خوش نما صدر تھے
دمِ رزم وہ "خونفشاں بدر" تھے

ہیں آتش فشاں ماہ طلعت یہاں　　کدورت یہاں ہے صفائی وہاں
اُدھر فارغ البال کل کارواں　　اِدھر قافلے وقفِ آہ و فغاں
ہے آکاش پر عام کیوں شانتی
زمیں کاش گر اس کا پہچانتی

جولائی سنہ ۱۹۵۰ء

اعتراف

نہ شہسوارِ جنگ جُو کے راستے کی گرد ہوں
نہ پائمالِ سبزہ خُو کے دل کی آہِ سرد ہوں
نہ میکدہ نشیں ہوں مَیں نہ بادیہ نورد ہوں
نہ محوِ نائے و نوش ہوں نہ شکوہ سنج درد ہوں
نہ اس کی طرح سُرخ ہوں نہ اُنکی طرح زرد ہوں
سیاہ فام قوم کا سیاہ فام فرد ہوں
نہ حاملِ جفا ہوں مَیں نہ قایلِ فنا ہوں مَیں
مجاہدانِ ہم وطن میں لائقِ ثنا ہوں مَیں
سیاہ فام قوم کا ملاحت آشنا ہوں مَیں
صباحتِ فرنگ کا تقابلی انا ہوں مَیں
دغا سے آشنا نہیں وفا میں شیر مرد ہوں
وفا پرست قوم کا وفا پرست فرد ہوں
دکھا رہا ہے آئینہ مجھے بقا طلب انا
صباحتی فریب کا خیال ہو گیا فنا
ہوا جو نکتہ رس مرا دلِ حقیقت آشنا
گروہِ نامور کا میں زعیم نامور بنا
نجات میرا مدعا ہیں داعی نبرد ہوں
نجات خواہ قوم کا نجات خواہ فرد ہوں

ہیں اہلِ ہند مجھ سے خوش مرا وطن بھی ہند ہے
وہی گلا وہی صدا وہی دہن وہی ہے نَے
غزل میں ثان سُر وہی، وہی ہے ٹھمریوں کی لَے
فریکل سنائے گا بلینک ورس تا بکے
سُفید اجنبی کی طرح کیا میں رہ نورد ہوں
سیاہ فام قوم کا سیاہ فام فرد ہوں

جولائی ۱۹۴۶ء

شاذ

خاکی جہاں ہو جلوہ دہِ تختِ سروری
نُوری دکھائیں خاک وہاں کوئی سبزی
کس درجہ خوشگوار ہے یہ ذوقِ برتری
کیونکر نہ شاذ کام ہو مجھ سے برادری
میری برادری کی نظر کیا ہے سرسری
میرا دماغ پست خیالوں سے ہے بری
میری نظر ہے ضابطۂ علم گستری

(۲)

پُر نور میرے علم و عمل سے ہے خاک پاک
شمس و قمر پہ میں نے بٹھائی ہے اپنی دھاک
دل اس کا داغ داغ، جگر اسکا چاک چاک
یہ دونوں رہروانِ ضیا پاش و تابناک
گھبرا کے دیکھتے ہیں مری شانِ رہبری
مریخ سے جری نے بھی پایا مجھے جری
لیکن نہ کر سکا کبھی دعوائے ہمسری

(۳)

کہنے لگے ہیں جانچ کے سب مجھ کو زندہ دل
میرے قویٰ ہوں بحرِ حوادث میں مضمحل!

کیواں بھی منفعل تھا عطارد بھی تھا خجل
کی میں نے ان کی آتشِ احساس مشتعل
کیا خوب مجھ سے آگے نکل جائے مشتری!
حیراں ہے میرے اوج پہ زہرہ سی بھی پری
نُوری پر کھو رہے ہیں مرادِ ذوقِ برتری

(۴)

میری برادری کے اراکین بھی ہیں شیر
مجھے "سراب" بحرِ حوادث کو سب دلیر
سب تیرنے کو آئے ہیں جینے سے ہو کے سیر
کی ہے شناوری میں کسی شیر نے بھی دیر!
ہم سب ہیں آشنائے مذاقِ شناوری
ایک آدھ ہو گا ایسا بھی رُکنِ برادری
جس کو ڈبو چکا غمِ احساسِ کمتری

فروری ۱۹۵۰ء

گُلابی تعصّب

جانِ چمن ہے کون؟ جمال آفریں گلاب
وہ دیکھو! سبز شاخ پہ جھُوما حسیں گلاب
ہر پھول ہے گلاب کے پہلو میں منفعل
کس پھُول کی جلو میں ہو اسٹرگیں گلاب
رونق طلب گلاب سے گلہائے رنگ رنگ
رونق فزائے نسترن و یاسمیں گلاب
سلطانِ رنگ و بو اسے کہتے ہیں اہلِ دل
روحانیوں سے پوچھئے کیا کچھ نہیں گلاب
ہنس مکھ گلاب شاعرِ بالغ نظر کی جاں

جانِ نشاط عارفِ عین الیقیں گُلاب
ان خوش مذاق نامور دل کی نہ پوچھئے
کرتا ہے جن کی روح کو اندوہگیں گُلاب
مرزا گُلاب بیگ کی تعریف کیا کروں
ایسے حسین دوست ہیں جیسے حسیں گُلاب
لیکن انھیں گُلاب سے نفرت ہے اس قدر
کہتے ہیں خود کو "بیگ" ہی کہتے نہیں "گُلاب"
دنیا ہے خوش گُلاب کی شان شگفتہ سے
اور ان کے دیکھنے میں ہے چیں بر جبیں گُلاب
کانٹے اُلجھ کے غصّہ دلاتے ہیں جس طرح
کرتا ہے میرے دوست کو یوں خشمگیں گُلاب
دل ہو اگر ملول کسی کا ہوا کرے
کہتے ہیں صاف صاف کہ اچھا نہیں گُلاب
اچھا نہیں گُلاب ـــــ نہ ہو لطف دیکھئے
ان کے خیال میں ہے ملال آفریں گُلاب
دل ان کا کھِل گیا جو کہیں موتیا کھِلی
ڈالی گرہ بھنووں میں جو دیکھا کہیں گُلاب
چمپا بھی سیوتی بھی چنبیلی بھی ـــــ ہے عزیز
یہ سب عزیز ان کے ہیں، پیارا نہیں گُلاب
بولے مجھے گُلاب بکف دیکھ کر وہ کل

بھیّا! اِدھر نہ لائیے رکھئے وہیں گُلاب
بے شک میں جانتا ہوں کہ اچھا نہیں یہ پھول
اور آپ مانتے ہیں کہ ہے بہترین گُلاب
نافہم ہیں گُلاب کی بو جن کو ہے پسند
بد ذوق ہیں نظر میں ہے جن کی حسیں گُلاب
ہندوستاں کو واسطہ ایراں کے پھول سے
ناحق کھِلا رہی ہے ہماری زمیں گلاب

جنوری ۱۹۴۵ء

تیرِ جستہ

(۱)

جان کر روشن دماغ اپنے کو اک میرا رفیق
طے یہیں بیٹھے ہوئے کرتا ہے یورپ کے طریق
نذرِ ظلمت ہے مگر ذہنیتِ روشن دماغ
زد میں صرصر کی فنا آمادہ ہو جیسے چراغ

(۲)

اس کی یورپ دوستی میں جب نہ مجھ کو شک رہا
میں نے اس "روشن دماغ" انسان سے اک دن کہا
کچھ خبر بھی ہے تجھے اس کی یہ تیرے سوٹ بوٹ
تیری نسبت کہہ رہے ہیں آہ کیا کیا جھوٹ موٹ

(۳)

مانتا ہوں میں کہ تو بدخواہ ملت کا نہیں

تیری ملت دشمنی کا یہ دلاتے ہیں یقیں

خیر، اس بہتان سے تجھ کو نہ ڈرنا چاہیئے

خوش نما ملبوس سے نفرت نہ کرنا چاہیئے

(۴)

زیبِ تن انسان کر سکتا ہے وہ موزوں لباس

چشمِ ظاہر بیں میں چست و چاق ہو جس کی اساس

لیکن، اے نادان! ہو کردار میں تبدیل کیوں

ضمِ کتابِ دل میں ہو بدلی ہوئی انجیل کیوں

(۵)

فرق اخلاصِ عمل کی شان میں آنے نہ دے

اس کو بھی انجیل کی صورت بدل جانے نہ دے

ایشیا والوں کو اخلاصِ عمل پر ناز ہے

اہلِ یورپ کی فطانت حق کشی کا راز ہے

(۶)

آہ، پندِ بے محل مقبول ہو کیا اس کی آس

کر چکا ہے جب کہ تو تبدیل کردار و لباس

لے زمانے سے "جدید العصر" بننے کا صلہ

غاصبانِ حق سے اب اے حق طلب کیوں ہے گلہ

مئی ۱۹۲۱ء

عشق بے تاویل

خورشید کی ضَو تیری ممنون، تاروں کی جلا مائل تجھ سے
تو شیئِ کمالِ حُسن ہے تو پرتوِ نورِ مہِ کامل تجھ سے
میں بھی ہوں توجہ کا طالب بن جاؤں کسی قابل تجھ سے
سلطانِ جہانِ عشق ہے تو آباد جہانِ دل تجھ سے
یونہی مجھے اپنی چوکھٹ پر اے دوست جبیں سا رہنے دے
جو رنج اٹھائے ہیں میں نے رُوداد کچھ ان کی کہنے دے
ہیں راہِ محبّت کے وہ نشاں جھیلی ہیں جو کڑیاں پئے درپئے
کہتی تھی وفا ہر منزل پہ ہوتا ہے سلوک اس شان سے طے
فرصت سے کبھی سُن دردِ دل اب تو ہی میری غمزدہ لے
اے دوست مرے دردِ دل کی تنقید بھی ہے تصدیق بھی ہے
اجمال ہے یہ تفصیل طلب لیکن یہ دم تفصیل نہیں
پہنچا ہوں میں اب اس عالم میں جس میں گزرِ تاویل نہیں
تاویل روا جب مجھ کو نہیں تادیبِ محبّت کیوں کرتا
دانائے حقائق ہو کر، کیوں اظہارِ حقایق سے ڈرتا
جب جان کی جاں اے دوست ہے تو دم تیرے سوا کس کا بھرتا
منظورِ نظر ہے دید تری میں کس کی اداؤں پر مرتا
مقصودِ محبّت تو ہی ہے مسجودِ تمنّا تو ہی ہے
پائی ہے عبادت میں لذّت تیری ہی پرستش جب کی ہے

تیری ہی محبّت کے نغمے ہیں وقتِ پرستش گاتا ہوں
تیری ہی تجلی کو اپنی بینش کا سہارا پاتا ہوں
اعجاز نما ہے حُسن ترا میں غش سے سنبھلتا جاتا ہوں
ہے ذوقِ پرستش راہ نما تیری ہی طرف کچھ آتا ہوں
تیری ہی طرف کچھ آنے کا ہے راز یہ تیرا حُسن فقط
ہے عشق عطیۂ فطرت کا ہر قسم کی تاویلات غلط

اکتوبر ۱۹۴۰ء

کافرانہ بے نیازی

کافر سے مُراد وہ حسیں ہے ... فی الحال جو حُسن آفریں ہے
اللہ رے بے نیاز کافر ... ہر ڈھنگ سے رنگِ حُسن ظاہر
نورِ دل و جان و پیکرِ نور ... پیرایۂ جلوہ ہائے مستور
سرِ دفترِ دلبرانِ خوش رو ... سرنامۂ داستانِ دل جو
پیمانۂ آرزوئے گلفام ... افسانۂ جستجوئے خوش کام

ہیں حُسنِ مجسم اس کے جلوے
جو ہیں مہ و مہر اس کے تلوے

ہر آن میں شانِ بے نیازی ... ہر شان میں آنِ بے نیازی
خودسر خوددار خودنگر دوست ... خوش رو خوش کام خوش سیر دوست
یہ دوست خزانہ دارِ عرفاں ... یہ دوست فسانہ سازِ ایماں
کس دشمنِ جاں کو کہہ دیا دوست ... کہنا ہی پڑا کہ جاں ہمہ اوست

کہتا ہے آلِ حسنِ فطرت نظارۂ حسن ہے عبادت
نیچر کی عطابتِ حسیں ہے
معیوب اسے پوجنا نہیں ہے
بینش سے ملا جو ذوقِ دانش جائز ہوئی حسن کی پرستش
مقصودِ بصیرت و بصارت کیا ہے؟ دل و چشم کی طہارت
جب تزکیۂ دل و نظر ہو یہ کافر قدس جلوہ گر ہو
ہے حسنِ نظر کا مدعا کیا میں دیکھ کے اس کو دیکھتا کیا
حسنِ بتِ کافر اور دیکھوں جانچوں اسے، اسکے طور دیکھوں
اس کی ہر ادا ہے پیاری پیاری
مشکل ہے بہت ادا شماری
اس پر بھی میں کچھ نہ کچھ کہونگا ہاں جائزہ اس حسیں کا لوں گا
سوجھیں کبھی شوخیاں جو اس کو بے چین دل اور مضطرب ہو
ہنس دے یہ حسیں تو چاند شرمائے چاند ابر میں، دل میں یہ جگہ پائے
جھینپے تو نگاہ اور چمکے چھپ جائے غلاف میں حرم کے
سہمے تو خدائے دلبری ہو مسجودِ بتانِ آذری ہو
اس حسن پہ یہ ادا طرازی
بے جا نہیں اس کی بے نیازی

نومبر ۱۹۴۶ء

جوانی

جوانی حسینوں کی ہنس مکھ جوانی　　فقط شادمانی فقط کامرانی
جوانی ہے قدرت کی وہ مہربانی　　جسے اہلِ دل کہتے ہیں زندگانی
نگاہوں کی مستی جوانی کا جوہر
جوانی ہے کیا؟ زندگانی کا جوہر

جوانی صباحت جوانی ملاحت　　جوانی لطافت جوانی نفاست
جوانی سے وابستہ ہر زندہ دولت　　صباحت، ملاحت، نفاست، لطافت
جوانی صباحت کی شیریں زبانی
جوانی ملاحت کی شیوہ بیانی

جوانی کی خوشش وضع بنیاد محکم　　جوانی کا پرچم ہوا ہی نہیں خم
یہ گلپاش موسم یہ گلپرشش عالم　　یہ دستِ حنائی یہ رنگین پرچم
مسرت جوانی کے گن گا رہی ہے
جوانی کے پرچم کو لہرا رہی ہے

جوانی کے عالم میں دنیا غزلخواں　　جوانی کے موسم میں دل سب کا شاداں
دل آرا، جوانی کے جاں بخش ارماں　　جوانی کے قبضہ میں درویش و سلطاں
جوانی کو آتا ہے قابو میں لانا
جوانی نے سیکھا ہے جادو جگانا

جوانی کا منظر سنہرا سنہرا　　دسہرا بھی بیسود کا سا دسہرا
پیامِ محبت جوانی کا چہرا　　جوانی کے سر ہے محبت کا سہرا

جوانی محبّت کی راہوں سے واقف
جوانی عداوت کی چالوں سے خائف

جوانی کی ہر نو جواں طرز دلکش | ادھر شرم رُخ پر ادھر لب پہ پُرش عش
جُھکی بات سننے جواں سال مہوش | نظر اس تجلّی پہ بھی کیا نہ ہو غش

سنبھلنے جو دے مجھ کو غش سے جوانی
جوانی کے جلوؤں کی دیکھوں روانی

جوانی کا جلوہ عیاں بھی نہاں بھی | جوانی کا پرتو یہاں بھی وہاں بھی
جوانی سے رخشاں زمیں بھی زماں بھی | جوانی سے تاباں مکیں بھی مکاں بھی

جوانی سے خالی کوئی گھر نہیں ہے
گراں تر جوانی بھی ارزاں تریں ہے

ستمبر ۱۹۲۹ء

برابر کا قول

اُصولِ مہر و الفت سے نہ وہ غافل نہ میں غافل
دبستانِ محبّت میں نہ وہ جاہل نہ میں جاہل
میں اپنے ذوق سے واقف وہ اپنے حُسن سے واقف
بحدِ صورت و سیرت نہ وہ سایل نہ میں سایل
وفا کے معجزہ کا اعتراف اِن کو بھی مجھ کو بھی
تصنّع کی کرامت کے نہ وہ قایل نہ میں قایل
محبّت ان کی لاثانی صداقت میری لافانی

حقیقت ہی حقیقت ہیں نہ وہ باطل نہ میں باطل

خوشامد، التجا، منّت، سماجت، آرزومندی
ظواہر ہیں — ظواہر کی کریں کیا خاک پابندی

مقامِ انس و عرفاں میں رہیں آزاد ہم دونوں
مثالاً نت نئی رسمیں کریں ایجاد ہم دونوں

وہ روٹھیں میں مناؤں وہ ہنسیں میں قہقہہ ماروں
وہ جائیں میں بلاؤں یوں رہیں دلشاد ہم دونوں

وہ چپ سادھیں، میں چپ سادھوں نہ وہ چھیڑیں نہیں چھیڑوں
جہانِ کیف کو یوں بھی کریں آباد ہم دونوں

محبّت زندہ باد — اب تک شگفتہ دل ہیں جس ڈھب سے
اسی ڈھب سے رہیں ناواقفِ فریاد ہم دونوں

"تفوّق" ہے پیامِ جنگ، ہم دونوں بری ہیں
"عقابی جنگ نامہ" ہے نہ وہ راضی نہ خوش ہوں میں

میں ان کے ناز اٹھاؤں اور میرا دل وہ بہلائیں
غرور انگیز شاہانہ نہ میں گاؤں نہ وہ گائیں

اکیلے پھول چن لیں باغ میں تو خیر چن بھی لیں
مگر تنہا پئے گلگشت میں جاؤں نہ وہ جائیں

گلہ کرنا تو جائز ہی نہیں ہے فرض ہے لیکن
زباں پر شکوۂ بے جا نہ میں لاؤں نہ وہ لائیں

انھیں سوگندیں دوں حسن کی وہ مجھ کو الفت کی

قسم لیلا و مجنوں کی نہ میں کھاؤں نہ وہ کھائیں
بآئینِ خرد میں بھی وفا کا دم بھروں وہ بھی
غرض، قانونِ فطرت کا ادب میں بھی کروں وہ بھی

جنوری ۱۹۴۸ء

ایک حسین تاویل

فضا میں ایک ہی تارا جھلک دکھاتا ہے
نڈھال ہے مگر اوپر سلکتا جاتا ہے
اُسی کے پاس نمودار دوسرا بھی ہوا
اسی کی طرح کچھ اس کے بھی مضمحل ہیں قویٰ!
نئے نئے ہیں طلسمی چمن کے پیرائے
جو مضمحل تھے وہی سُرخرو نظر آئے
یہ تیسرا ہے وہ چوتھا وہ پانچواں تارا
ذرا سی دیر میں منظر بدل گیا سارا
کہاں کے پھول نہ تھی ایک پنکھڑی بھی جہاں
خدا کی شان، بصیرت فزا بہار وہاں!
نصیب انھیں سے ہوا آسماں کو حُسنِ قبول
بلاؤں کا نہیں ہوتا اب آسماں سے نزول
رہینِ حُسن ہے روشن خیالیٔ انساں
نہیں کچھ اور بجز حُسن حاصلِ عرفاں

نگاہ شوق ہے سب کی اب آسماں کی طرف
دہیں اگرچہ ہے مریخ اب بھی تیغ بہ کف
بفیضِ حُسن گماں ہے یقیں بدل تو گیا
برا خیال جو تھا دلنشیں، نکل تو گیا

عیاں ہے بدر سے شخصیتِ "جنابِ صدر"
یہ شخصیت بھی بڑھاتی ہے آسماں کی قدر
نظر نواز مُرقّع ہے چاند تاروں کا
انھیں میں دھیان ہے دنیا کے حُسن کاروں کا
انھیں کا حُسن بناتا ہے آسماں کو حسیں
یہ نور پاش مُرقّع نہیں تو کچھ بھی نہیں

عجیب چیز ہیں بکھرے ہوئے سنہرے پھول
بنا ہے مطلعِ نُور آسماں کا عرض و طول
متاعِ حُسن ہے اہلِ نظر کی خوش نگہی
حسین تاروں سے "کالی بلا" بلا نہ رہی
نقاطِ حُسن ہوں جب اس طرح اثر انداز
تو "ذاتِ حُسن" کو ہم کیوں کریں نظر انداز

اپریل ۱۹۳۵ء

حُسنِ تمام

حُسن تفصیلِ انوارِ صبحِ ازل
حُسن اجمالِ اسرارِ صبحِ ازل

حُسن تھا جلوہ گر حُسن ہے جلوہ گر
حُسن یونہی رہے گا فروزندہ تر

حُسن شامِ ابد کا سہانا سماں
حُسن صبحِ ازل کا نمایاں نشاں

مہر بھی آئینہ دار ہے حُسن کا
ماہ بھی ایک معیار ہے حُسن کا

حُسن سے ہے خوشنما سروِ آزاد بھی
حُسن کے زیرِ سایہ ہے شمشاد بھی

حُسن گل بھی ہے گلکار بھی حُسن ہے
حُسن ہے دل کشا دم بدم پے بہ پے

حُسن دل میں نہاں حُسن رُخ سے عیاں
حُسن ہی حُسن ہے کیا عیاں کیا نہاں

حُسن بیدارِ مسجودِ فنکار ہے
چشمِ فنکار اسی کی پرستار ہے

حُسن مجنوں طلب حُسن فرہاد جو
حُسن زینت دہ عالمِ رنگ و بو

حُسن معجز نما حُسن لیلیٰ نظر
حُسن شیریں لقا حُسن جادو اثر

حُسن شرحِ کنایاتِ دلدادگاں
حُسن شرحِ اشاراتِ دوشیزگاں

حُسن تابندہ تر حُسن پائندہ تر
حُسن کے بہرہ مندوں میں شمس و قمر

حُسن سب کچھ ہے سب کچھ میں خامی نہیں
حُسن ذوق آفریں بلکہ جاں آفریں

حُسن سمرن جپائے میں سمرن جپوں
حُسن کافر بنائے میں کافر بنوں

حُسن سجدے کرائے تو سجدے کروں
حُسن مومن بنائے تو مومن بنوں

حُسن نور السموات والارض ہے
فرض ہے حُسن کی بندگی فرض ہے

حُسنِ مطلق ہے اے دوست میرا خدا
اور حُسنِ مقید وہی دلربا

جس کا ہر جلوۂ حق اثر حُسن ہے
میں ادھر جبہ سا ہوں جدھر حُسن ہے

مارچ ۱۹۴۶ء

دو چاند

آپ ہو منظر پہ آ کے آپ ہی جو چھپ جائے
چھپ چھپ کے جو اپنا رنگیں جلوہ خود دکھلائے
باتوں باتوں میں جو ہنس دے ہنس ہنس کے شرمائے
شرما شرما کے جو ہنس دے کہ میرا دل تڑپائے

میٹھی میٹھی باتیں کرنے کاش وہی پھر آئے
ممکن ہے تو اپنی مینا بھی ساتھ اپنے لائے

آئی میری چمپا آئی ــ یہ گنگن یہ بات
ننھی منی مینا کو بھی لے آئی ہے سات
مینا دہراتی جاتی ہے اس کی ہر اک بات
واہ سرِ شام ایسا جلوہ ــ خوب کٹے گی رات

ان گہری باتوں کو سمجھے مورکھ پنچھی ــ ہائے
کرنے دو مینا کو بسیرا نیند مجھے کیوں آئے

اس شب بیداری پہ صدقے ہر گونہ آرام
ماہ جبیں چمپا کے رُخ سے نورانی ہے شام
کالے کالے گیسو اس کے اچھے خاصے دام
روشن روشن آنکھیں اس کی تاباں رخشاں جام

گدگدیاں بھی دل لگیاں بھی ــ کیف نہ اب بھی چھائے
ہے یہی اپنے دل کا ارماں رات یونہی کٹ جائے

نیند کہاں اب کھیل رہے ہیں ہم دونوں چوسر
اس منظر کو دیکھنے والا چاند ہے اک اوپر
چھوٹی چھوٹی مدھم مدھم قندیلیں لے کر
چاند کے آگے پیچھے افتاں خیزاں ہیں اختر
میرا چاند ہے میری چھپا۔ چاند یہاں خود آئے!
چپ سادھے وہ چاند وہاں۔ یہ چاند مجھے بہلائے

مئی ۱۹۴۷ء

دو دو چاند؟ نہیں ایک ہی چاند

وہ مہ سبک خرام ہے یہ ماہ خوش خرام
یکساں نہیں اسی لئے ان کا پروگرام!

روشن دیئے جب اُس نے ستاروں کو راہ میں
داخل یہ میرا چاند ہوا خوابگاہ میں

فوجِ نجوم کا وہ "کمانڈر" ہو گیا
شطرنج کھیلنے کو یہ تیار ہو گیا

دیکھا کیا وہ داخلہ نوری سپاہ کا
قانون وضع اس نے کیا "اپنی چاہ" کا

اس چاند کی اداؤں پہ صدقے ہے میرا دل
روشن ہے اس سے منظرِ دنیائے آب و گل

عام اُس کی چاندنی کرۂ آب و گل میں ہے
نور اس کا خوابگاہ میں یا میرے دل میں ہے

یہ خوابگہہ یہ نیند یہ انداز یہ شباب
سوتا ہے میرا چاند۔ نکل آیا آفتاب

چل پھر کے رات بھر وہ ادھر ماند ہو گیا
بیدارِ خوابِ ناز سے یہ چاند ہو گیا

سورج کے سامنے بھی نہیں میرا چاند ماند
حیرت سے دن پکار اٹھا چاند اب بھی چاند!

وقتِ سحر وہ چاند "غم آگیں نظارہ" ہے
کہتے ہیں سب کہ چاند نہیں "ابر پارہ" ہے

حیرت سے فلسفہ کا "معلّم" تمام دن

دے دے کے درس رات کو ہوتا ہے مطمئن

دونوں کا مختلف ہے نظام العمل مگر
ہے خودسری کا دبدبہ دونوں سے جلوہ گر

کیا جانے سیکھ آئے ہیں کس سے یہ رسم و راہ
خود رائے یہ بھی چاند ہے خودسر وہ بھی ماہ

چاہا اگر طلوع سرِ شام ہو گیا
ورنہ تمام رات قسم کھا کے سو گیا

گردش کی ٹھان لی تو یونہی رات کاٹ دی
تاروں کی راہ اپنی تجلی سے پاٹ دی

میرا بھی چاند ہنس کے بچھاتا ہے جب بساط
بنتی ہے "تیرہ فائیِ شب" جلوۂ نشاط

کس نے کہا کہ نیند کے جھونکے اب آتے ہیں
جلوے تو میرے چاند کے جادو جگاتے ہیں

کیا ناظرانہ چال ہے دیتا چلا ہے مات
کیا خوب رتجگا ہے گزرتی چلی ہے رات

کہتا ہوں جب میں ہنس کے گزرتی ہے رات یوں
کہتا ہے میرا چاند کہ دیتے ہیں مات یوں

پڑتی ہے کب "گھڑی" پہ مرے چاند کی نظر؟
کرتا ہے مہرپوش جب آئینۂ سحر

ہے آسماں کا چاند کدھر، کیا خبر مجھے
آتا ہے اپنا چاند ہی اب تو نظر مجھے

---

۲ فروری ۱۹۵۱ء

توحیدِ مجازی

مرا ذوقِ نظر ان کے تصور کا بنا سانچا
انھیں دیکھا انھیں سمجھا انھیں پرکھا انھیں جانچا

انھیں کی یاد سے وابستہ میری زندگی ساری
خیال آرا انھیں سے خواب میرا میری بیداری

کبھی میرے تصور میں وہ میٹھی نیند سوتے ہیں
کبھی ایک خاص عالم میں نظر افروز ہوتے ہیں

انھیں پہ حصر کیا ہے ان سے نسبت جس نے بھی پائی
بنا میرا خیالِ حُسن رس اُس کا تماشائی

کبھی وہ خوابگاہِ ناز یکسر جگمگاتی ہے
نگاہِ خواب آلود ان کی جس میں مسکراتی ہے

کبھی وہ حجلۂ زرتار شان اپنی دکھاتا ہے
جہاں حُسنِ تبسم ریز رنگ اپنا جماتا ہے

کھلا ہر مظہرِ خوبی پہ ان کا حُسنِ تام اچھا
سکوت اچھا کلام اچھا خرام اچھا قیام اچھا

انھیں کو منتخب میں نے کیا ہے خوش جمالوں میں
وہی میری نگاہوں میں وہی میرے خیالوں میں

رہیں ممتاز سب سے سیر میں بھی خوبیاں ان کی
بچھی جاتی ہیں ان کی رہ میں خود ہمجولیاں انکی

نظر آئے نہ کیونکر باغ کا باغ ان کے قابو میں
مہارت کی ہے پیدا انکی خوش چشمی نے جادو میں

اسی جادو سے ہے میرے دماغ و دل کا یہ عالم
حیات آباد عرفاں میں وہی وہ ہیں مرے ہمدم

جُدا ان کے تصور سے نہ دل میرا نہ جاں میری
یہ توحیدِ مجازی ہے حقیقی ترجماں میری

جولائی سنہ ۱۹۲۱ء

"نظموں کی سب سے اچھی ترتیب یہ ہے کہ
"نظموں کی کوئی ترتیب نہ ہو"
برنرڈ شا

بہ تصرفِ یک لفظ

اب تک آپ نے جتنی نظمیں ملاحظہ فرمائیں ان کے عنوان اپنی اپنی حد میں کسی نہ کسی پہلو سے مربوط معلوم ہوتے ہیں۔ اب دیکھیے کہ ایک نظم قدردانیٔ وقتِ عزیز پر روشنی ڈالے گی تو دوسری سے گھریلو دلچسپیاں اُجاگر ہوں گی۔ —— ان سرخیوں میں برائے نام ربط نہیں، مگر ہیں مزے کی چیزیں، دمبدم یونہی مزے بدلتے جائیں تو اضافۂ برمحل "بے محل" محسوس نہ ہوگا۔

کوتل گھڑی

معتمدِ حلقۂ اربابِ ذوق
دے گئے ہیں کل مجھے عنوانِ شوق

شوخ ہے عنوان کہ سنجیدہ ہے
دوست بہر حال پسندیدہ ہے

شاملِ حلقہ مجھے ہونا ہے آج
آج ہی برہم ہے گھڑی کا مزاج

آج ہی کم بخت نے چپ سادھ لی
وجہِ خموشی بھی نہ مجھ سے کہی

میں بھی چپ ہوں دیکھ کے اس کا یہ ڈھب
ٹائم ہے کیا کون بتائے گا اب

زد میں ہے خورشید جلالت مآب
درد میں جو ہو ٹھہر کے کیوں دے جواب

دن کو بھی تارے نظر آئیں گے کیا
ٹائم وہ زرد پوش بتائیں گے کیا!

خیر! نہیں ہے مرا دل محوِ یاس
اور بھی ہے ایک گھڑی میرے پاس

جو ہے خوش آہنگ بھی چالو بھی ہے
اب یہ کرائے گی رہِ شوق طے

ہونگے میرے منتظر اربابِ ذوق
نظم سناؤں گا بہ عنوانِ شوق

جاؤں گا بر وقت وہاں جاؤں گا
وقت شناسی کا صلہ پاؤں گا

وقت شناسوں کی ہے عزت بڑی
وقت بتائے گی یہ کوتل گھڑی

جون سنہ ۱۹۵۴ء

عید کے دو پہلو

عشرت کدہ اُمرا کے مدِ نظر غم سے اُمرا ہیں بیگانہ
ہے عیش پسندی کا یہ اثر پڑھتے نہیں غمگیں افسانہ

گفتار ہے ظاہر چنگیزی کردار سے ظاہر خونریزی
گفتار رہی سفاکانہ کردار رہی بے باکانہ

شاداب ہر اک تہنیت سے ہیں زیرِ لب نشاطِ دیدہ ہیں
کیا آج ہی خوش یہ عید سے ہیں عید ان کیلئے ہے روزانہ

دم صرفِ محبتِ حسن کا بھریں سرشار رہیں سرشار کریں
یہ بھی تو نہیں معلوم انہیں کیا جرم ہے کیا ہے "جرمانہ"

حد میں نہیں طالعمندی کی تکلیف و خمار و حیرانی
زد میں نہیں راتب بندی کی مینا و سبو و پیمانہ

یخود جو بنائے جلوۂ مے جھنکارتے جائیں پے در پے
اس ہاتھ میں جام اس ہاتھ میں ہے تفریحِ چمن کا پروانہ

ہیں اپنے سوا سب سے غافل آسائشِ جاں ہے مقصدِ دل
دل انکا ہے کیا؟ راحت منزل گھر انکا ہے کیا؟ شادی خانہ

خوش اپنے حسیں ایوان میں ہیں آرائشِ تن کے دھیان میں ہیں
دیکھو اُمرا کس شان میں ہیں شانِ اُمرا ہے شاہانہ

صافہ ہے مطلا اس کی چمک دے کاہکشاں کو گلدستہ
اچکن ہے معطر اس کی دمک لے عطرِ حنا سے نذرانہ

سورج کی شعاعوں کا گویا کمخواب میں ہے تانا بانا

اس نخاس پہ ہی موقوف ہے کیا بھجوایا ہے اور اک بیعانہ

دُربارئ جم کا آئینہ خود ان کی چمکتی پیشانی

سرشاری جم کا گنجینہ خود ان کا دمکتا کاشانہ

ڈھب ان کا بنایا بڑھ کھانے کچھ اور زیادہ مستانہ

عید آئی تو لائی ان کے لئے ایک تازہ پیامِ رندانہ

(۳)

عید آئی اثر اس کا پھیلا روٹی کیلئے یاں واویلا

ملبوس وہی میلا میلا — اک عید ہے یہ بھی مولانا

بھوکوں کو جو سوجھی غیبِ شب کی افلاس نے بیٹھا انکی پھکی

ہر چیز پہ رال ان کی ٹپکی، دیکھے کوئی ان کا للچانا

وہ بول رہی ہے ماں کے اٹھو کہتا ہے یہ لڑکا روٹی دو

ان فاقہ زدہ معصوموں کو آتا ہے تڑپ کر تڑپانا

منہ آنسوؤں سے دھوتا ہے کوئی کھانے کیلئے روتا ہے کوئی

روتا ہے کوئی سوتا ہے کوئی — ہے یہ یونہی بھوکا سو جانا

رو رو کے یہ بچی اب سوئی بچی کی طرح ماں بھی روئی

ماں اس کی کرے کیا دلجوئی کل سے نہ ملا جس کو کھانا

باپ اپنی جگہ پر ہے نادم ہوش اس کے رہیں کیونکر قائم

جاگیر کا نائب ہے ظالم سیکھا نہیں دینا دلوانا

ہنسنے کی اجازت تک نہ ملی عید اور رہی افسردہ دلی

افسوس کلی دل کی نہ کھلی آتا ہے اسے تو مرجھانا
سعیِ غربا کی قیمت کا اندازہ لگائیں کیا اُمرا
خوں جن کا پسینہ بن کے بہا زیبا ہے انھیں کو اِترانا
رفتار سے اپنی باز آئیں کردار پہ اپنے شرمائیں
سکھ جن کی بدولت خود پائیں جائز نہیں انکو کلپانا
عید اب کی منائیں گے غربا شان اپنی دکھائینگے غربا
حق اپنا جتائیں گے غربا کہتا ہے یہ ہر مردِ دانا
گاتے ہیں انھیں کے گیت انجم ان کیلئے بنتے ہیں قلم
منظور خدا را سیکھو تم ان سرد دلوں کو گرمانا

اک دن یہ جھلا دیں گے دیکھو میداں میں لڑنا گھبرانا
آجائے گا اب آپ اپنے کو موقع پہ سمجھنا سمجھانا

اکتوبر ۱۹۴۶ء

فقیرانہ بے نیازی

اللہ نے ہم کو دی ہے قدرت — ہم کیا ہیں؟ حجاز کی حقیقت
محتاج ہمارے "خود بدولت" — کرتے ہیں روا ہم ان کی حاجت

چاہیں جسے تخت پر بٹھا دیں
چاہیں جسے تختہ پر لٹا دیں

سمجھے کوئی بطریق راز داری — سکہ ہے دلوں پہ کس کا جاری؟
مٹھی میں ہے کائنات ساری — مخفی نہیں مقدرت ہماری

مرعوب ہیں تاجدار ہم سے
مجذوب ہیں شہریار ہم سے

آئے گئے سیکڑوں ہی طوفاں　　دل ہو نہ سکا کبھی پریشاں
ہر فکر سے ہم رہے گریزاں　　ہے ذکر خدا کا راحتِ جاں

نقارۂ دل پہ جب پڑی چوب
ہنستے رہے پڑھ کے "شہر آشوب"

ہیں سیر و سلوک میں جو ہم چاق　　قابو میں ہیں انفس اور آفاق
توحید صفات و ذات میں طاق　　ہر موجِ نفس ہے روح تریاق

سِرِّ ازلی کے راز داں ہم
رازِ ابدی کے پاسباں ہم

ہے بس میں ہمارے دل ہمارا　　اپنوں کی مدد بھی ناگوارا
کر کے رہِ غیر سے کنارا　　ڈھونڈا کئے ایک ہی سہارا

اللہ کا آسرا ہے کافی
کس کام کی نسبتِ اضافی

نظروں میں جو خاک و زر ہے یکساں　　پھرتے نہیں در بدر پریشاں
اللہ رے شگوفہ کار ساماں　　ویرانہ میں ہم ہیں گل بداماں

حائل نہیں شہ کی راہ میں ہم
پابند ہیں خانقاہ میں ہم

جاگیر پہ لات مارتے ہیں　　دل کی دنیا سنوارتے ہیں
جذباتِ حسیں ابھارتے ہیں　　انسان کا روپ دھارتے ہیں

"مردانِ خدا خدا نباشند"
"لیکن ز خدا جدا نباشند"

خاموش و سخن طراز ہیں ہم
مسکین و جہاں نواز ہیں ہم
دانائے حدود راز ہیں ہم
ہر چیز سے بے نیاز ہیں ہم
دو گز کا یہ بوریا ہمارا
ہے تخت سے بڑھ کے ہم کو پیارا

جنوری ۱۹۴۷ء

ایک دلچسپ مقابلہ

یسم و زر میں خسرو قاروں صفت کا دھیان ہے
پوچھو اس کے دل سے کس مشکل میں اسکی جان ہے
عارفانِ حق کے حق میں ہے عروسِ مرگ حُور
موت کے ڈر سے پریشاں دل نہیں ان کا شعور
یاد سلطان کو سیاست کا نہیں آموختہ
ورنہ کیوں بنتا دبالِ جان و دل "اندوختہ"
علم حق سے شاد اہلِ دل کی جانِ پاک ہے
ہیں نڈر یہ بھی اجل بھی عادتاً بے باک ہے
ہو گئی شاہانہ کیفیت گریزاں شاہ سے
جام نکلا جا رہا ہے قبضۂ جم جاہ سے
چشمۂ آب بقا ہے عارفوں کے آس پاس
ہو گئی تابندہ عمر جاوداں کی زندہ آس

نزع میں ڈھونڈے سہارا اس طرح گردوں سریر

"جو بدارِ مرگ بھی ہو اس کے حق میں دستگیر!

نزع میں بھی زندہ دل ہیں واصلانِ حق نگر

دل نشیں ان کا ہے گویا ان کے رُخ سے جلوہ گر

آج غمخانہ وہی ہے تھا جو کل عشرت کدہ

شعبدہ گر کون؟ سلطاں، سلطنت کیا؟ شعبدہ

خاکیوں کی زیب و زینت ہیں جو نورانی بشر

روشن اپنے جلوے رکھیں گے وہی روشن گہر

قبرِ شاہِ آسماں رفعت کو گنبد کی ہوس

دل مرا دھڑکا 'ارے یہ کیا — قفس اندر قفس!

لاجوردی سائباں اوپر ہے نیچے یہ قبور

عارفوں کی تربتوں سے بھی چھنے عرفاں کا نور!

——————— فروری ۱۹۵۴ء

مابہ الامتیاز

مہتاب کے دلکش جلوؤں نے دلچسپ بنایا تاروں کو
ارماں ہے کہ دم بھر ٹھیراؤں دو چار سُبک رفتاروں کو
آوارہ منش ہر سیارہ جاتا ہے تو ہنستا جاتا ہے
ہنسنے کے سوا چلنے کے سوا، کیا اور بھی کچھ کام آتا ہے
نیچر ہے جہاں گوہر افشاں دُرپاش جدھر ہیں نظارے
رُخ اپنا ادھر کرتے ہی نہیں چلتے ہوئے ہنس مکھ سیارے

میری نظرِ خوش بیں ہے اُدھر جاں بخش جدھر ہے نظارہ
تاروں کی قسم تاروں کی طرح ہر سمت نہیں میں آوارہ
دیتا ہوں طراوت پھولوں کو لیتا ہوں صباحت پھولوں سے
وہ میری نگاہوں سے خوش ہیں میں شاد ہوں اُنکے جھولوں سے
اشجار کو پانی دیتا ہوں اشجار سے میوے لیتا ہوں
وہ سنگ نہیں میں دنگ نہیں کچھ لیتا ہوں کچھ دیتا ہوں

جس وقت لبِ دریا تھا دریا کی روانی تیز ہوئی
دریا کی طرح میں لہرایا، ہر لہر مسرت خیز ہوئی
ہر خاص فضا نے خوش ہو کر خود مجھ کو سنایا راگ اپنا
سیکھا نہیں تاروں سے میں نے اپنے ہی شرار دل میں تپنا

بے فکر نہیں، رکھتا ہوں خبر ہیں آج بھی ذرّے ذرّے کی
مانندِ نجوم سرگرداں عادت نہیں مجھ کو نخرے کی

ہے حوصلہ مندی میری عیاں انسان بھلا ہیں سیارہ نہیں
کردار نہیں ہے میرا نہاں خوش باش ہوں میں آوارہ نہیں
نفرت ہے مجھے شر بازوں سے میں امن پسند دل سے خوش ہوں
ہے ترکِ فلک ظالم ۔ ہوگا یہ روا نہیں میں ظالم کش ہوں
یہ سب ہیں مری نظروں میں شر رہو "ترکِ فلک" یا اور کوئی
انساں ہے اگر عمدہ انساں کرتا نہیں اس پہ جور کوئی

مختصر مفید

بادل گرج گرج کے بدلتے چلے ہیں رنگ
آیا سکندر اور سجا رن میں طبلِ جنگ
گھوڑے بھی تیز و تند سپاہی بھی شوخ و شنگ
دیوانہ وار دوڑتی ہے جنگ کی اُمنگ
سر لشکروں نے پاس جو کی جنگ ہی کی رائے
دارا کی فوج نے بھی جواباً ڈھول بجائے
کیا جانے کون مدِ مقابل پہ غالب آئے
نقارہ زن ہے دونوں طرف جوشِ نام و ننگ

کرنے لگے سکندر و دارا مقابلہ
عنوانِ قتلِ عام ہے ان کا مقاتلہ
سرخی ہے "لالہ زار" کی "خونیں معاملہ"

ہے عرصۂ حیات سرِ رزم گاہ تنگ

سمجھو تو صورتاً نہیں دارا ہی خستہ حال
دیکھو تو آئینہ ہے سکندر کا بھی مآل
ہیں دونوں "یکہ تازِ فنا" مائلِ زوال

یوں جاں بلب "مسابقتِ زندہ" کی ترنگ

انساں کا جانبین میں ہے نرخ بین بین
خوں میں نہا چکے ہیں جوانانِ جانبین
نعم البدل ہے "نغمۂ ہستی" کا شورو شین

بادِ ہوس اڑا کے رہی حسرتوں کا رنگ

ایسے ہی کیا مقابلے ہوتے ہیں آج کل ؟
نوکِ قلم نے توڑ دیئے ہیں سناں کے پھل
شہ زور کر گرائے وہ کم زور سر کے بل

دے صلح کا پیام جو لے کر پیامِ جنگ

نومبر ۱۹۵۳ء

شانِ فریقین

(۱)

رعیت کو لٹ جائے گا، راج کیا
نہ پہنیں گے اب حکمراں تاج کیا
چمن ہو گیا ان کا تاراج کیا زرِ گل کی قیمت ہے یاں آج کیا

(۲)

مرا دھیان ان سے الجھتا رہا
میں ان کو "گرو جی" سمجھتا رہا
کنور جی! یہی ہیں "مہاراج" کیا ارے ــــ کل یہی کیا تھے ہیں آج کیا

(۳)

نہ وہ آن بان اب نہ جاہ و حشم
نہ وہ عز و شان اب نہ طبل و علم
کھلونے ہیں اب تخت کیا تاج کیا تماشا نہیں راج پاٹ آج کیا

(۴)

بتاؤ مجھے کون ہے باجگیر
کسے شاہِ شطرنج کس کو وزیر
غنی ہونے والے ہی محتاج کیا نہیں در بدر حکمراں آج کیا

(۵)

وہ دھوکے نگاہوں کے ہیں یاد ابھی

شرر ہو گئے تھے ستارے کبھی
قریبِ نظر ہیں یہ افواج کیا ستارے شرر ہو گئے آج کیا

(۶)

معزز سلاطین ہیں اب ذلیل
نہیں ہے یہ دعویٰ مرا بے دلیل
رعیت کو شاہوں کی ہے لاج کیا محلّات کا رنگ ہے آج کیسا

(۷)

وہ "فردوس منزل" وہ غلمان و حور
وہ شاہانِ خوش دل وہ عیش و سرور
خوش ان سے ہیں شاہانِ بے تاج کیا فریقین کی شان ہے آج کیسا

جنوری ۱۹۵۱ء

شہ دینے کے ڈھب

واہ کیا خوب گریباں ہے ہلال اس پہ نثار
وہ ابھی میرے گلے کا کہیں ہو جائیں نہ ہار
ٹھیک نکلا میرا اندیشہ بایں عزّ و شرف
بڑھ گیا ہاتھ "مجیدہ" کا گریباں کی طرف
دیکھ کر ان کا یہ ڈھب میں نے بڑا کام کیا
دستِ سیمیں کو، اسی وقت، وہیں تھام لیا
ہاتھ ریشم کی طرح نرم، وہ ناخن، وہ حنا
چھیڑ کا لطف اٹھانے کی پڑی خوب بنا

ترجماں فاقہ کشی کی ہے یہ دھیمی آواز
شور و غل کا ہوا اس طنزیہ "رسمی آغاز"

یا مذاق اپنا بصد غیظ اٹھا کر ٹپکا
توڑ کر رکھ دیا پانی کا بڑا سا مٹکا

ہاتھ میں لے کے کنول پھینک دیا آنگن میں
چاہتی تھیں کہ لگے آگ مرے تن من میں

لیکن اس آگ کو میں نے عمداً بھڑکایا
لطفِ ہر قسم کی آواز کا یکسم پایا

بجلیاں کان کی میں ہاتھ میں لے کر دیکھوں
برق پاش اس مرے فقرے پہ وہ ہوں اُف رے فسوں!!

ایک زیور کا لیا نام، تو پورا گھنٹا
توڑ کر ڈال دیا صحن میں یوں! کیا کہنا

کہیں کنگن، کہیں بالا، کہیں مالا، کہیں نتھ
واہ رے غیظ! یہ کیا اپنی بنائی درگت

"حسنِ معصوم" شرارت پہ کمر یوں باندھے!
عشقِ مجرم بشریت کو بھلا شہ بھی نہ دے!!

فروری ۱۹۵۲ء

چڑھاوا

ہنسی مسرتِ دوشیزہ کی نشانی ہے
نظر نہ آئے جو ہنس مکھ وہ کیا جوانی ہے
ہنسیں جواں تو یہ تارے ہنسیں یہ ماہ ہنسے
ہنسیں جواں تو جوانوں کی خوابگاہ ہنسے
ہنسا کے سوئیں تو ہنستے ہوئے نظر آئیں
کبھی کبھی یہ نظارے مجھے نظر آئیں

مرے مذاق کی ضد ہے شعور بیگ کا طور
خیال ان کا سُبک ہے مگر ہے لائقِ غور
ملیں گی ہنس کے جو دوشیزگانِ مہ پارہ
شعور بیگ سمجھ لیں گے ان کو آوارہ
کریں گے قدر یہ کیا ہو نشانِ کم سن کی
جمالِ دوست نہیں عیب چیں نظر ان کی
قمر مثال ثریا نظیر زہرہ جبیں
کوئی حسینہ بھی جانِ شعور بیگ نہیں
بطونِ شعر میں بھی ہے گا شر بظاہر نیک
ہر اک حسینہ میں ڈھونڈیں گے عیب لیکن نہ ایک
سڈول جسم ہے زلفیں دراز ستواں ناک
مگر شقیلہ کی آنکھیں ہیں کتنی وحشت ناک

مے نشاط سے آنکھیں تو ہیں بہت سرشار
مگر شکیلہ کی گردن نہیں صراحی دار
ہرن بھی دیکھ کے ہو مست یہ حسیں گردن
مگر جمیلہ کے رخ پر نہیں ہے بھولا پن
نہیں ملی "ہمہ تن حسن" کوئی دوشیزہ
شعور بیگ کسے دیں یہ نت یہ آویزہ

نومبر ۱۹۵۲ء

تلخیٔ خوشگوار

خوش ہے مرا دل تیرے لڑکے کالج میں پڑھتے ہیں پڑھیں
جوزف! کیا مرے بچے اسکول کے زینے بھی نہ چڑھیں
موٹر کیا ہے سمن! سلگے تجھ کو بٹھا کر طیارہ
شعلہ مری سیکل کی ہوا سے ہو تیرے دل کا انگارہ
تیرے نئے سوٹ آئیں سل کر شوکت پاشا! لندن سے
پھر بھی تجھ کو لاگ ہو میرے بوسیدہ پیراہن سے
شیخ لطیف! اس قصر سے باز آ دیکھ ہوائی ہے یہ محل
ہو گیا نذر باد حوادث شاہ جہاں کا دل بادل
مرزا گلشن بیگ! نہیں تو مطمئن اپنی "جنت" پر
میرا گھر گیا ہے؟ اک دوزخ، دوزخ پر بھی تری نظر
دھوم مچاتے ہیں وہ نیری' زلہ ربا جو ہیں تیرے
منعم خاں! دیں دعوت عبرت کیا تجھ کو فاقے میرے

دولت کے ماحول میں تُو اے زرکش بہمن! پلتا ہے
وقتِ ضرورت میں زر چاہوں تو دل ترا جلتا ہے

قارون آنکھیں کھول کے اپنی دیکھ یہ میری ناداری
خون مرا تو چوس رہا ہے کب سے؟ کب تک خونخواری

فرعون! اب تک وہم خدائی اپنے دل میں پالے تو
میرے دل کو نہ ہونے دے گا وہم ترا کب تک یکسُو

خود سر ہامان! اپنے انا کے تو صدقے ہے پئے در پئے
ناحق تیری فطرت میری خودداری کے ہے درپئے

مَیں تیرا شاگرد نہیں ہوں اپنا فن مجھ کو نہ سکھا
میں بھی جری ہوں جا اے رستم! اور کسی پر دھاک بٹھا

ہدیہ میرا چھوڑ سکندر! تیرا تخت ہے تیرے لیے
تیری عالمگیر ہوس کے کس نے تگّے دنیا سے کئے

میری قناعت کے فریادی حاتم! مجھ سے بات نہ کر
یونہی مَیں قائل ہوں تیرا آ کے ادھر خیرات نہ کر

رنگ جمے کیا اے جم! تیرا میرا دل کیا جام نہیں
میں نے ببانگِ کوس کہا ہے تیرے جام سے کام نہیں

جنوری ۱۹۵۳ء

حلقۂ گُل و کُل

کُل حسینوں کے گلے کا ہار کیا سب پھول ہیں
تیری بے جا پرستشیں حد درجہ نامعقول ہیں

بیٹیاں حوّا کی ہیں کیا سب کی سب زہرہ جبیں
بڈھیاں پھولوں کی کتنی دلہنوں پر ہنس پڑیں

کیا کسی بد وضع کا دیکھا نہیں سہرا کبھی
عترتِ آدم میں ہیں کیا چاند کے ٹکڑے سبھی

کیا کسی نوشاہ کی دیکھی نہیں تو نے برات
کیا کہوں پھولوں پہ کس کس کے ہیں کیا کیا التفات

آدمی تو خیر ـــ ہے گل پوش موٹر کار تک
واہ یہ پٹرول کا بھبکا! یہ پھولوں کی مہک!!

گل رخوں کی زیب و زینت کیلئے ہی کب ہیں پھول
تیری پھولوں والی پرستش سے ہے میرا دل ملول

باغ میں بھی دشت میں بھی کچھ ادھر ہیں کچھ ادھر
ہر طرف ہیں پھول کانٹوں سے زیادہ منتشر

کوئی معمورہ ملے یا کوئی ویرانہ ملے
ہر جگہ کچھ شکریئے سننا پڑے گا کچھ گلے

جانبِ شہرِ خموشاں ٹک نظر کا رخ تو پھیر
خاک کے تودے بھی آئیں گے نظر پھولوں کے ڈھیر

کیوں میاں! اچھوتوں کی سُن لی داستانِ دلخراش
تذکرہ ہنسنے ہنسانے کا بھی اب کر لے تلاش

کیا فقط رندوں کی خاطر بادۂ گُلفام ہے
ہاں یہ نعمت حصۂ رندانِ خوش انجام ہے

پیر و مُرشد، مولوی صاحب، جنابِ محتسب
میکشی کو جانتے ہیں سر بسر لہو و لعب
قاضی و مفتی خطیب و شیخ سب ہیں مردہ دل
مے کبھی بے ساختہ کہہ دیں تو ہو جائیں خجل
درج فردِ میکدہ ہیں زندہ دل رندوں کے نام
کیوں رقم ہوں ان میں ایسے مردہ دل رندوں کے نام
میکش و مے کی بدولت میکدے میں دھوم ہے
دھوم دھام ایسی نہیں کتب میں وہ محروم ہے
ہیں یونہی جن و ملک بھی نشہ سے نا آشنا
مست آتا ہے نظر تو صرف رندوں کا "انا"
حور و غلماں کے لئے ہے مے نہ رضواں کیلئے
ہے خصوصی ساغرِ مے بزمِ رنداں کے لئے
گُل گلستاں خُم خمستاں سب پہ قابض رند ہیں
مست ہو کر بھی خبردارِ فرائض رند ہیں
ان کا پہلا فرض ہے پیرِ مغاں کی بندگی
کہہ رہے ہیں "زندگی بے بندگی شرمندگی"

تیری پرستش سے ہے تاباں میرے دل کی کائنات
بس میں ہیں زندوں ہی کے ہے سر چشمۂ آبِ حیات

آہ ٹیگور!

انسان سب کے سب ہیں بہ ہر حال ہم وجود
ہم وضع، ہم شبیہ، ہم اجلال، ہم نمود
ہم علم و ہم ارادہ و ہم نطق و ہم حیات
قدرت سے بھی یہ شاد ہیں سمع و بصر کے سات
نیچر کے التفات سے سب شاد کام ہیں
اس درجہ خاص خاص عطائیں بھی عام ہیں
ذوقِ موافقت پہ جتائیں ہم اپنا حق
اس اتحادِ خلقی و فطری سے لیں سبق
ہے ضامنِ فضیلتِ کُلّی یہ اتحاد
یہ اتحاد ہے شرف و فضل کا مداد
پیغام اتحاد کا ٹیگور نے دیا
زیر و زبر فساد پسندوں کو یوں کیا
کیا ایسے اتحاد میں بھی شانتی نہیں
دنیا جو اِن کی قدر ابھی جانتی نہیں

ہے شانتی نکیتن اسی آرزو کا صید
موسیقیاں ہیں اس کی متاعِ زبور و دید
ٹیگور کا خیال جہانگیر کیا فقط
کرتا رہا قواعدِ تہذیب منضبط
ان کے جلائے ذہن کے جلوے ہیں نو بہ نو
تقدیس کا بھی نور ہے تعریب کی بھی ضو
تھی خوش نما جو یہ ہمہ گیری خیال کی
بے صورتی میں چھپ گئی صورت ملال کی
ٹیگور کا جو قال تھا ٹیگور کا وہ حال
ٹیگور کا ظہور دبطوں آئینہ مثال

ستمبر ۱۹۴۱ء

بشرطیکہ......

کیوں دوستو ہمیشہ میں حقدار طیش کا
ثمرہ فقط تمھیں کو ملے باغِ عیش کا!
شاہد تمہارے عیش کا ہے گلستانِ عیش
یہ برگِ گل ہے یا ورقِ داستانِ عیش؟
آ، دیکھ، یاد رکھ، نہیں یہ جائے طیش کی
گردیدہ ہے بہار اسی گلزارِ عیش کی
دیکھا! — کلی کلی ہی نہیں ترجمانِ عیش
سوسن کی بھی زباں پہ ہے داستانِ عیش

کیوں مشفقانِ ہم سن و ہم وصف و ہم خصال
کیوں دوستانِ یکدل و یک رنگ و یک خیال
کتنی ہے دل پذیر بہارِ جہانِ عیش
سوسن نے ختم کی نہیں کیا داستانِ عیش

کیا ذکرِ عیش "حالِ گزشتہ" ہے مختصر
ہوگا درازتر یہ بیانِ لذیذ تر
لطفِ زبانِ سوسن و کیفِ بیانِ عیش
تو بھی تو سُن ہماری طرح داستانِ عیش

افسوس ہے کہ مَیں نہیں سوسن کا ہم زبان
کیا جانے کس زبان میں ہے سوسن گہر فشاں
ہو جاؤں مَیں ابھی بخوشی پاسبانِ عیش
اردو میں وہ سنائے اگر داستانِ عیش

مارچ ۱۹۵۲ء

وجودی رنگ

غنچے کھل کر پھول ہوئے
خوشتر دتھے مقبول ہوئے
غنچے اور ہیں اور ہیں پھول! یہ خلش افزا بحث فضول
ان جھگڑوں کو طول نہ دے
کانٹے لے کر پھول نہ دے
پٹنہ میں گنگا دیکھی دہلی میں جمنا دیکھی
پریاگ ان کا ہے سنگم
وہ اس میں یہ اس میں ضم
بھیا! کون اب کہتا ہے یہ جمنا یہ گنگا ہے
سورج اور ہے اور ہے چاند!!
تو ہی کہہ دے کون ہے ماند
ہر گھر میں دونوں کا ہے نور اتنے پاس اور اتنے دور
نورِ حقیقت ہیں یک
وہم دوئی ہے کیوں ان پر؟
ڈالی ہو یا ڈنٹھل ہو پتہ ہو یا کونپل ہو
کھول کے رازِ سربستہ
دیتے ہیں وہ گلدستہ
رنگ ہے جس کا عرفانی وضع ہے جس کی نورانی

شہو دی ڈھنگ

برق اور اس کو برفانا
برف اور اس کو برقانا
گرچہ نہیں ہے ناممکن
ممکن سب کچھ ہے، لیکن
برف ہے جامد، برق تپاں
یک رنگی دونوں میں کہاں
لوہا اور ہے، اور ہے آگ
لوہا چھو لے آگ سے بھاگ
آگ میں جب لوہا تپ جائے
آپ اپنے کو آگ بتائے
کان کا لوہا آگ نہیں
ہاتھ کی لاٹھی ناگ نہیں
انگارہ ہے انگارہ
کون کہے اس کو تارہ
اڑ گئی اس کی خاکستر
تاباں ہے وہ خوش گوہر
بود اس کی نابود ہے اب
دیکھ اسے موجود ہے اب
پیتل ہو جائے سونا
مشکل ہے ایسا ہونا
لاکھ ہوں یہ دونوں ہم رنگ
پھر بھی ذی عقل و فرہنگ
اس کا رنگ جماتے ہیں
خاکہ اس کا اڑاتے ہیں

فروری ۱۹۵۲ء

مردمِ دیدہ و دامانِ نظر

دامانِ نظر کی ہے ضیا "مردمِ دیدہ"
ضو مردمِ دیدہ کی نہ "دیدہ" نہ "شنیدہ"
وسعت میں دکھاؤں کسے دامانِ نظر کی
نرگس نہیں طالب "نظرِ فیض اثر" کی

مریخ و عطارد جو ہمیشہ سفری ہیں
نرگس کی طرح محوِ تماشائے دیدہ وری ہیں
لیکن کسی قابل میں سمجھتا نہیں ان کو
یہ شپرہ چشم آئے نظر کیا کبھی دن کو

کیواں ہے معلق، نہ ادھر کا نہ ادھر کا
اندازہ کرے کیا مرے دامانِ نظر کا
کم بیں ہے بہت مشتریِ نیک مقدر
آنکھ اس کی پڑی کب مرے دامانِ نظر پر

زہرہ سے ہے شکوہ نہ گلہ شمس و قمر سے
وابستہ ہیں یہ سب مرے دامانِ نظر سے
دامانِ نظر میں نظر آتا نہیں کیا کیا
یہ کاہکشاں کیا، یہ پرن کیا، یہ ثریا کیا

اک "گوشۂ دامانِ نظر" ہے یہ فلک بھی
چھپتے نہیں اب میری نگاہوں میں ملک بھی

صورت نہیں جن کی بشریت کے مماثل
ہوں مردمِ دیدہ کے وہ کیا مدِّ مقابل
دامانِ نظر میں نظر آتی ہے خدائی
ظاہر مرے دامانِ نظر کی ہے بڑائی
چھوٹوں میں اگر قیدِ مکاں، قیدِ زماں سے
یہ شعر پڑھوں مردمِ دیدہ کی زباں سے
جلوے نظر آتے ہیں جو دامانِ نظر میں
ان سب سے زیادہ ہے کشش حسنِ بشر میں

اپریل ۱۹۵۲ء

خوش تریں قیافہ

خدا کی قدرت کا ہے تماشا — یہ ننھا بچّہ یہ چاند پاشا
بتاؤں میں اس کو جب تماشا — تو ہاتھ پھیلائے بے تحاشا
بُلاؤں مٹھی جو بند کر کے
جگہ سے اپنی کبھی نہ سرکے
زمیں پہ گھٹنوں کے بل چلے جب — اسی کو بس دیکھتے رہیں سب
وہ خود بھی دیکھے ہمارا یہ ڈھب — مگر نہ رکھے کسی سے مطلب
اُٹھا کے سب کی نظر کے پردے
وہ رینگنا اور تیز کر دے
سُنیں کئی لوریاں تو سویا — کسے خبر کتنا وقت کھویا

سب آگئے پاس جب یہ رویا — تمام گھر کی ہے جان گویا
سعیدہ کی بے کلی ہے ظاہر
مجیدہ آئینہ لے کے حاضر

رشید نے اپنی ترکی ٹوپی — اتار کے اس کے سر پہ رکھ دی
ظفر نے تلووں میں گدگدی کی — رضی نے پیہم بجائی تالی
سعید و مشتاق گا رہے ہیں
غرض سب اس کو منا رہے ہیں

وہ ماں کا اپنی طرف بلانا — ٹھمک ٹھمک کر وہ اس کا آنا
بہن بلائے تو مسکرانا — مگر بہن کی طرف نہ جانا
جتاتی ہے اس کی ہوشیاری
بہن نہیں ماں سے بڑھ کے پیاری

مجھے بھی پہچاننے لگا ہے — کبھی کن انکھیوں سے دیکھتا ہے
کبھی ہے خوش اور کبھی خفا ہے — ابھی سے کیا مطلب آشنا ہے
جو مَیں نے دی ہاتھ میں جلیبی
بڑھی کچھ اور اس کی دلفریبی

مزے مزے کے کئے اشارے — یہ شاعرانہ ہیں استعارے
اٹھا کے ہاتھ اپنے پیارے پیارے — دکھا رہا ہے یہ چاند تارے
سبب اشاروں کا جانتا ہوں
مَیں ہونہار اس کو مانتا ہوں

نظر کم آتا ہے ایسا بچپن — ملیح چہرہ شریف چتون

قیافہ سے اس کے ماہر فن　　کرے حقائق کی شمع روشن
پکار اٹھا خوش تریں قیافہ
ہوا ہے ملت میں خاص اضافہ

اکتوبر ۱۹۵۲ء

شیریں لثمگی

مجھے یوں کھینچ لائے جلوۂ حق جادۂ حق پر
غزل چھیڑے نہ کیوں محسن مقید حسن مطلق پر
محبت کے ترانے گا رہا ہوں صورت بلبل
بھلا زاغ وزغن مجھ کو سکھائیں طرز شور و غل!
ستاروں کی ہم آہنگی خصوصی مدعا میرا
میں ان کو خوش کروں وہ گیت گائیں جا بجا میرا
میں لذت پاؤں اپنے چاند سے چھپ چھپ کے ملنے کی
نہ پوچھوں چاندنی سے کیفیت راتوں میں کھلنے کی
مجھا برق و رعد سے ہنگامہ آرائی نہ سیکھوں گا
ثریا ہو کہ پروین درس عشرت ان سے ہی لوں گا
مدارات ان کی ایسی دلکشا ایسی حسیں راتیں
حسیں راتیں نئی باتیں نئے ڈھب کی ملاقاتیں

مذاق انجمن سازی کو تدریجاً گھٹاؤں گا
گھریلو زندگی سے آئے دن رغبت بڑھاؤں گا

گھریلو زندگی رنگیں مزاجوں کا مُرقّع ہے
مُزیّن ہے مُکلّف ہے مُذّہب ہے مُرصّع ہے
پڑھا۔ لالے سے یک رنگی کا روزِ شب سبق میں نے
اڑایا ہے روانی میں کب اندازِ شفق میں نے
کبھی ساغر پہ ڈالا ہاتھ مینا کو کبھی چھیڑا
کیا غرقاب مَیں نے یوں غم و اندوہ کا بیڑا
سمندر کا یہ طوفاں! میں طمانچے کھاؤں طوفاں کے
نہیں، دو گھونٹ پینا چاہتا ہوں آبِ حیواں کے
قدح خوارِ بقا آثار بننے کی تمنّا ہے
مجھے اس دور میں کیا شاہِ خود مختار بننا ہے؟

اکتوبر ۱۹۵۲ء

عالی حوصلگی

فروغِ جرأتِ رندانہ دیکھا میں نے خوش ہو کر
کہ مجھ میں بھی ہے پنہاں فطرتاً یہ خوش نما جوہر
بطرزِ رند جینے کا سلیقہ میں نے سیکھا ہے
کہا کس دن کہ پینے کا طریقہ میں نے سیکھا ہے
چلن سیکھے سحر سے صورتِ خورشید ابھرنے کے
نہ سیکھے شام سے ڈھب قعرِ ظلمت میں اُترنے کے

اگر میں دفعۃً اندیشۂ کاہش سے گھبرایا
مجھے بالیدگی کا درس دینے کو ہلال آیا
اُبھارا مجھ کو برقِ طور نے اظہارِ مقصد پر
شرارے آئیں کیا میری نگاہِ غیظ کی زد پر
پہاڑوں نے مجھے تعلیم دی ہے استقامت کی
حد "آوارہ بگولے" ہیں میری چشمِ حقارت کی

خجل جادو گروں کو سحرِ نامعقول میں پایا
یونہیں فطرت کے ہر اعجاز پر ایماں نہیں لایا
کروں کیوں مشق چمگادڑ سے میں اوندھا لٹکنے کی
سکھائی "طائرِ نسریں" نے طرز اوپر سے جھپٹنے کی
درختِ انبہ سے گر میں نے سیکھے ہیں افادت کے
صنوبر کے لئے موزوں ہیں نخرے حسنِ قامت کے
ہوس ہے قمریوں کو خوش نما طوقوں سے سجنے کی
مگر مجھ کو ہے عادت شیر کی لے میں گرجنے کی
سرِ میداں دہاڑ اٹھا ضرورت پر میں شیرانہ
عمل میرا شریفانہ رجز میرا دلیرانہ
جھجک کیسی؟ پرانی دوستی پیکِ اجل سے ہے
عیاں میری دلیری میرے میدانِ عمل سے ہے

نومبر ۱۹۵۳ء

مشاہدہ و معاملہ

وہ آئے معجزہ ہے ان کا آنا
گیا سو وقت پھر ہاتھ آگیا نا!

وہی منظر وہی دلبر وہی گھر
وہی خلوت وہی بننا بنانا

وہی میری نظر بازی کا عالم
وہی ان کی نگہ کا مسکرانا

وہی ساغر وہی مینا وہی مے
وہی ساقی وہی مینا پلانا

محبت کی صداقت نے سکھایا
بصد اخلاص ہاں میں ہاں ملانا

وہی باتیں وہی راتیں وہی دن
وہی ہم ہیں وہی ہنسنا ہنسانا

ہنسا دینا تو بچوں کا بھی ہے کھیل
مگر آساں نہیں رونا رلانا

وہ یاد آنا شب غم کا یکایک
وہ دل کا حال برموقع سنانا

خلوص دل کی ہے یہ بھی کرامت
ابھی ہنسنا ابھی آنسو بہانا

خیال ان کا بدل دینے کی خاطر
وہ میرا دفعتہً یہ شعر گانا

فروغ حسن کا مقصد نہیں کیا
کمال اپنا بہر صورت دکھانا

مرا مطلب سمجھ کر ہنستے ہنستے
جواباً ان کا وہ یوں گنگنانا

کمال عشق کا مطلب نہیں کیا
بہر عنواں محبت کا جتانا

سوال اچھا جواب اس سے بھی اچھا
ضروری ہے دلوں کا گدگدانا

ہنسا میں اور وہ بھی مسکرائے
خوشا باہمدگر یوں آزمانا

وہ ہاتھ آئی ہوئی عشرت پہ قابو
وہ یاد آئے ہوئے غم کو بھلانا

وہ دلجمعی نہ کچھ دہشت نہ وحشت
وہ خوش وقتی کہیں آنا نہ جانا

بس اے منظور بس اس سلسلہ کو
نہیں منظور اور آگے بڑھانا

نومبر ۱۹۵۲ء

اجمالِ تفصیل نما

جو خود نہ ہوں پابند زباں جن کی نہ ہو بند
اس باغ میں باندھیں نہ ہوا اپنی وہ تا چند
میں ہوں اُنھیں آزاد خیالانِ وطن میں
ہے دھوم مری زمزمہ سنجانِ چمن میں
میں شاہدِ فطرت پہ نہیں نغمہ سرا کیا
نخلِ طرب و عیش نہیں میرا ہرا کیا
سائل ہے نئے کیف کا ہر آن نیا دور
"رات اور ہے دن اور ہے شام اور سحر اور"
میں دیدبۂ مہرِ درخشاں کا ہوں قائل
جائز نہیں افکارِ جمالِ مہِ کامل
تاروں کے سُنوں گیت تو اس درجہ مزا لوں
موسم جو نہ ہو سیب کا نارنج اُچھالوں
جھومیں اگر اشجارِ چمن جھوم اُٹھوں میں
چہکے کوئی طائر تو ابھی وجد کروں میں
بُلبُل ہو اگر اپنے نشیمن میں غزل خواں
سینے میں دل اپنا نظر آئے مجھے رقصاں
کلیوں کا فسوں سازِ ترنم جو مزا دے
دیں ساز انھیں مرے فرحت بخش ارادے

دوشیزۂ حُسن آئے جانے کو جہاں رنگ
کیوں ہو نہ میرا ذوقِ خوش آہنگ ہاں دنگ
طاؤس کا ہر رقص جو گلشن میں پر افشاں
"پیرایۂ گلگشت" بنے عیش کا عنواں
پھولوں کی سبھا ہو کہ عنادل کی ہو محفل
میرے لئے ہر بزم ہے رازِ کششِ دل
لہراؤں میں لہرائے اگر حوض کا پانی
ہے روح فزا نہرِ سُبک رَو کی روانی
ہر سمت لہکتا ہوا سبزہ ہے طرب زا
پیارا ہے زمرّد سے زیادہ مجھے سبزا
سبزے کی طراوت سے خنک سب کی ہیں آنکھیں
کیسا ہے زمرد ــــــ غُربا خاک بتائیں

مئی ۱۹۵۲ء

میں بھی کچھ عرض کروں!

آپ ہی کی نظر ہے دُور بیں کیا — اوروں میں ستارہ بیں نہیں کیا
تاروں پہ ہیں آپ خشمگیں کیا
"تنویرِ نگہہ" بھی آتشیں کیا؟!

کیا سب عُلما ہیں مہرباں ہیچ — وہ ہیچ ہیں۔ ان کے امتحاں ہیچ
بھاری بھاری یہ ڈگریاں ہیچ
آپ ہی کی سند ہے، بہتریں کیا

تو "ایسا" تُم "ایسی" آپ "ایسے" — سرکار! یہ تبصرے ہیں کیسے
ہم لوگ ہیں شاید "ایسے ویسے"
کام آئے گی یہ چُناں چُنیں کیا

دل کی نہ دکھایئے کدورت — بے جا۔ بے وقت۔ بے ضرورت
ہے مُنعمِ شہر خوب صورت
مُفلس نہیں گانوں کے حسیں کیا

زُہرہ کا ہے روپ یاں نظر بند — چاند آپ کے گھر میں چند در چند
مہوش ہیں بس آپ ہی کے فرزند
دنیا میں نہیں ہے مہ جبیں کیا

ہر قوم کو حُسن پر ہے غرّہ — خورشید نما ہے ذرّہ ذرّہ
آپ ہی نہیں عیب سے مُبرّا
آپ ہی کا ہے "حُسن آفریں" کیا؟!

نومبر ۱۹۴۹ء

اشرف المخلوقات

اُڑائیں پرچم زمیں ہوا میں گرد باد اگر — نظر نہ آئے سرنگوں نشانِ رفعتِ بشر
جمائیں کوہسار اگر زمیں کا رنگ جابجا — بشر کی سربلندیاں کبھی نہ ہوں گریز پا

زمیں کا رازِ تمکنت بشر کے زیرِ غور ہے — بشر زمیں پہ ہو تو کیا وہ اور ہے یہ اور ہے
وہ اور ہے یہ اور ہے اگرچہ ان میں رشتہ ہے — اسی طرح کہ رشتہ دارِ آسماں فرشتہ ہے

ملک فلک سے ہے الگ ملک سے ہے فلک جدا — کہ "انقلابِ ماہیت" کا مسئلہ ہے طے شدہ
زمیں بشر سے ہے جدا بشر زمیں سے ہے الگ — (انگوٹھیوں میں جڑ گئے انگوٹھیاں نہیں ہیں نگ)

علامتِ زوال ہے بشر اگر ملک بنے — نہایتِ کمال ہے زمیں اگر فلک بنے
وہ گردِ مہر گھوم کر شکستہ حال ہو گئی — جبینِ عرش چوم کر دکھائی اس نے چھب نئی

بشر کے اقتدار سے نہیں ہے منحرف زمیں — زمیں کے اختیار میں بشر کا ارتقا نہیں
زمین اپنی حد سے کیا نکل سکی ہے انچ بھر — بشر ہے مطلق العناں کبھی اِدھر کبھی اُدھر

بشر کی رہگزر بنی نظر نواز کہکشاں — بشر کا ارتقا نہیں زمیں کی آنکھ سے نہاں
بشر سے رشتۂ زمیں نہیں ہے دور کا اگر — بشر کی روح سے تہی زمیں ہے قصۂ مختصر

مئی ۱۹۵۲ء

دستاویزِ زرکار

"جہانِ عمرانیات" زر کا خمیر
خشتِ زر سے بنائے ہر تعمیر

زر سے معمورۂ جہاں آباد
زر نہ تخریب ہو ظہور پذیر

آئیں یہ ہر سُو نظر کھنڈر ہی کھنڈر
زر نہ ہو تو زمیں ہو بے تنویر

زر کی گلکاریاں بہار آور
زر سے باغِ جہاں بہشت نظیر

زر نہ ہو تو زنانِ حُورِ جمال
خود نہیں اپنے خواب کی تعبیر

پائی زر کی بدولت انساں نے
بزمِ جاہ و جلال میں توقیر

قصرِ شاہی میں روشنی زر سے
زر سے پُر نور خانقاہِ فقیر

دست کش زر سے کوئی بھی نہ ہوا
"جذب" جب تک ہُوا نہ دامن گیر

طالبِ زر نہیں فقط مجذوب
ان کو پوشاک چاہیئے نہ حصیر

دوڑتے پھرتے ہیں اِدھر سے اُدھر
یہ بگولے نہیں "ہَوا" کے اسیر

جا بہ جا گا رہی ہے زر کے گن
لکشمی جی کی بولتی تصویر

سرنگوں زر کے آگے نوعِ بشر!
قُوّتِ زر کی دیکھ لی تاثیر

زورِ زر ابتدا سے زر طلبی
زر پرستی مآلِ سعیِ اخیر

میں نہیں زر پرست سچ ہے مگر
مائلِ زر ہے میری ہر تدبیر

زر کے جلوے ہیں روشن القصہ
"الغرض" زر جلائے چشمِ بصیر

دیکھ کر زر ہمک اٹھیں اطفال — سائلِ زر ہیں کیا جواں کیا پیر
"وقت رحلت کے کس کنے زر تھا" — پوچھتے تھے یہ بھولے بھالے ممبر
بعد رحلت کے کون گھر میں تھا — میں بھی پوچھوں تو سب کہیں گے شریر
مضحکہ خیز میر کا ہے بیاں — خندہ آور ہے میری بھی تقریر

خیر بے سود گفتگو کب تک
مہرباں آزمائیے تقدیر

توبہ توبہ یہ بے حسی توبہ — ڈال دی کس نے پانوں میں زنجیر
کوئی اتنا بھی ہو نہ پست خیال — فرشِ خاک آپ کے لئے ہے سریر
نہیں کھادی کی بھی قنات نصیب — آپ کے در پہ پردہ ہائے حریر!
آتشِ فاقہ سے حرارہ تو — نظر آپ آئیں کس قدر دلگیر!

روٹی روٹی پکاریں بچے تو
رنگِ رخ آپ کا نہ ہو تغییر!

پیدل اسکول جائے لڑکی تو — کتنا محجوب آپ کا ہو ضمیر!
فیس کالج کی جب پسر مانگے — آپ کی عزت اس کو دے تعزیر!
وہ کتابیں نصاب کی چاہے — آپ اس سے کہیں پڑھو "تفسیر"
بھائی حرکت میں کیا نہیں برکت — کچھ کما لائیے بلا تاخیر

راہ کسبِ معاش بند نہیں
زر تو زر خاکِ راہ دے اکسیر

جنوری ۱۹۵۴ء

یک در گیرم و محکم گیرم

جب تیری نگاہ مسکرائی — دنیا مرے دل کی جگمگائی
تصویر بہار اے حسیں بت — پھولوں میں دکھا رہی ہے یہ رُت
آئینے بہار کے ہیں سب پھول — کرتے ہیں نمائش طرب پھول
توحید پسند فطرتاً ہوں — دیکھوں میں انھیں کہ تجھ کو دیکھوں

آلی فالی ہے ان کا پھیرا
جلوہ ہے سدا بہار تیرا

دربارِ قمر ہے اب بھی دربار — حاضر ہیں ثوابت اور سیار
ذوقِ وحدت پرست میرا — دم ان کا بھرے کہ صرف تیرا
تجھ سے ہے مشامِ جاں معطر — دم تیرا بھروں گا زندگی بھر
یکسو ہے نظر بھی دل بھی یکسو — اب مجھ پہ چلائے کون جادو

دامن کشِ انتشار ہوں کیا
میں بھی اختر شمار ہوں کیا

طے کر کے قمر ہزار ہا کوس — حاصل کرتا ہے تیرا پابوس
ہو ہو کے فدا تری جبیں پہ — بچھوائی ہے چاندنی زمیں پر
پامال کر اور چاندنی کو — دل چاند کا تاکہ مطمئن ہو
میرا بھی ہے دل ترے اثر میں — ارماں ہے کہ تیری رہگزر میں

ہو جاؤں میں پائمال خود ہی
اوج اپنا دکھاؤں چاند کو بھی

ستمبر ۱۹۵۲ء

"یک در گیرم و محکم گیرم"

جب تیری نگاہ مسکرائی — دنیا مرے دل کی جگمگائی
تصویرِ بہار اے حسیں بت — پھولوں میں دکھا رہی ہے یہ رُت
آئینے بہار کے ہیں سب پھول — کرتے ہیں نمائشِ طرب پھول
توحید پسند فطرتاً ہوں — دیکھوں میں انھیں کہ تجھ کو دیکھوں

آنی فانی ہے ان کا پھیرا
جلوہ ہے سدا بہار تیرا

دربارِ قمر ہے اب بھی دُربار — حاضر ہیں ثوابت اور سیّار
ذوقِ وحدت پرست میرا — دم ان کا بھرے کہ صرف تیرا
تجھ سے ہے مشامِ جاں معطر — دم تیرا بھروں گا زندگی بھر
یکسو ہے نظر بھی دل بھی یکسو — اب مجھ پہ چلائے کون جادو

دامن کشِ انتشار ہوں کیا
میں بھی اختر شمار ہوں کیا

طے کر کے قمر ہزار ہا کوس — حاصل کرتا ہے تیرا پابوس
ہو ہو کے فدا تری جبیں پر — بچھوائی ہے چاندنی زمیں پر
پامال کر اور چاندنی کو — دل چاند کا تاکہ مطمئن ہو
میرا بھی ہے دل ترے اثر میں — ارماں ہے کہ تیری رہگزر میں

ہو جاؤں میں پائمال خود ہی
اوج اپنا دکھاؤں چاند کو بھی

ستمبر ۱۹۵۲ء

دعوتِ موازنہ

برائے نام بھی انسانیت نہیں جن میں — غریب آدمیوں کو وہ جانور سمجھیں!!
کریں سلام یہ جھک جھک کے وہ سلام نہ لیں — یہ دوڑ دوڑ کے جائیں وہ بات تک نہ کریں

یہ جاں نثار وہ "بیزار" کیا تماشا ہے
سیاہ فام تونگر بھی "چاندیا شا" ہے

پڑھا کے دیکھئے اخبار پڑھ سکیں نہ رواں — خلاصہ پوچھئے معنی کہاں مراد کہاں
ہے ان امیروں سے بہتر ہمارا ابجد خواں — چڑھا جو نشۂ دولت یہ بن گئے ہمہ داں

خیال ان کا سبو میں نگاہ کوڑے پر
سوار رہتے ہیں ہر دم ہوا کے گھوڑے پر

کہے غریب "ورینا" کبھی کبھی "وردا" — مگر امیر سمجھتا رہے اسے "بردا"
غریب اس کا نہ اس کے پدر کا پروردہ — نہ اس کا جد ہی غریبوں میں سر برآوردہ

کہاں خیال غریب آدمی کو سیج درجے کا!
رہا امیر وہ بیٹا ہے "چاند سورج" کا

زمیں پہ اس کا بھی ایوان اس کا بھی گھر ہے — مگر دماغ تونگر کا آسماں پر ہے
مآلِ زیست میں کیا اس سے وہ فزوں تر ہے — نہ دو گز اس کی زمیں ہے نہ اس کی گز بھر ہے

نہیں امیر سے کچھ کم غریب کی تربت
مگر امیر کی تربت پہ ہے بہت غربت

لذتِ تمام

سرِ ابر وہ حق چمکنے لگا
نقابِ رُخِ بُت سرکنے لگا
ادھر رنگ اس کا جھلکنے لگا
ادھر جاں میں اس پر چھڑکنے لگا

وہ پیر وہ نظارۂ سراسیمگی
یہ جلوہ ہے سرمایۂ زندگی
مرے دل پہ آنکھ اٹکی پڑنے لگی
مرا جامِ عشرت چھلکنے لگا

ملیں تو بہ کو اطلاعیں ملیں
جو ہیں مطمئن ایسے دل کیوں ہلیں
شگوفے نئے کھل رہے ہیں کھلیں
بھلا دل مرا کیوں دھڑکنے لگا

درِ گلشنِ راز ہو باز ادھر
رہے بند ادھر چشمِ حسرت اثر!
یہ ہے افزا۔ میرا ذوقِ نظر
جمالی جھلک سے جھجکنے لگا

طرب زا ہوائیں لپکنے لگیں
دل افزا فضائیں لہکنے لگیں
فسوں ساز کلیاں چٹکنے لگیں
مہکتا گلستاں چہکنے لگا

جو یوں فصلِ گل پہ ہو شبنم نثار
کرے کیوں نہ موتی نچھاور بہار
بھڑکنے لگے شعلہ ہائے بہار
چہکتا گلستان دہکنے لگا

حسیں ہو تو ایسا شگفتہ مزاج
شگفتہ دلی پائے حسن سے رواج
چہکتے دہکتے گلستاں میں آج
میں اس گلبدن ہی کو تکنے لگا

حضور۔ غیاب۔ حضور

اُف یہ حیا یہ حیرتیں یہ "نظری مقابلے"
میری یہ شوخ حسرتیں ان کے یہ خاص فیصلے
"ہاں" ہے کبھی کبھی "نہیں" دونوں ہی کیف آفریں
رُوح فزا یہ مہ جبیں مختصراً یہ فاصلے

دورِ شرابِ لالہ گوں کیوں نہ ہو راز جوشِ خوں
کیوں نہ ہوں تابشِ دروں نور فشاں معاملے

شامِ وصال کا سماں لینے لگا ہے سسکیاں
دینے لگے ہیں مرغِ اذاں صحن میں پھاڑ کر گلے

میرے مکاں میں جلوہ گر جو رہے رات رات بھر
اب ہے کہاں وہ خوش نظر ہائے وہ دن وہ مشغلے

کیفِ حضور پاؤں گا واں میں ضرور جاؤں گا
شعر انھیں سناؤں گا یاد ہیں جو برے بھلے

میں تو ہوں مردِ تیز رو کیوں نہ دکھائے میری خو
حوصلہ ہائے نو بہ نو تازہ بہ تازہ ولولے

گھر سے نکل کے پا لئے عزم سفر کے سب مزے
زیرِ قدم مچل گئے جیسے تمام مرحلے

منزلِ دوست آ گئی صورتِ دوست دیکھ لی
اب تو برائے نام بھی ہم میں نہیں ہیں فاصلے

پھر وہی کیف دما دم پھر وہی ساغر و سبو
پھر وہی عام گفتگو پھر وہی خاص مشغلے

عیش میں کیوں پڑے خلل جب ہو سوال بر محل
اب یہی خود کریں گے حل مہر و وفا کے مسئلے

پاس سے یہ اٹھیں گے جب بولیں گا میں بصد ادب
چھوڑ کے مجھ کو جانِ جاں میری جاں کدھر چلے

اپریل سنہ ۱۹۴۸ء

عہدِ نو عشقِ نو

جھٹپٹے سے ظہورِ نور اب کیا / شامِ ہند اور شمعِ طور اب کیا

نہ ملی گرچہ لذتِ گفتار / سرِ رہ پائی دولتِ دیدار

قدرۃً وہ مجھے دکھائی گئیں / "خود نہیں آئیں بلکہ لائی گئیں"

دلربا ان کا اولیں جلوہ / جانفزا ان کا دلنشیں جلوہ

کیف ہی کیف ہو گیا طاری / کیا کہوں خواب تھا کہ بیداری

جم گیا ان کا دھیان یوں دل میں / خوش مسافر ہو جیسے منزل میں

تھی فقط ضبطِ ذہن ان کی یاد / ماورا وہم، ماسوا برباد

فکر تھی جامِ وصل پینے کی / دھن کسے تھی زیادہ جینے کی

عشرتِ مختصر سرورِ تمام / لذتِ یک شبہ نشاطِ دوام

یاد المختصر انھیں کی تھی / ان کی دوری بھی اک تجلی تھی

جس طرف بھی نظر اٹھاتا تھا / اپنے آگے میں ان کو پاتا تھا

آنکھ جس وقت بند کر لیتا / ان کا نظارہ روشنی دیتا

ان کی وہ جلوہ باریاں ہے ہے / میری یہ بے قراریاں ہے ہے

تا کجا بے قرار میں / کیوں نہ تنہائیوں سے دردِ دل کہتا

اپنے آپ میں اور میرا یہیں سر / میرا اپنوں کے ساتھ کی پھر سیر

ان کا گھر ان کو جب دکھا آیا / سب ہی گھر کو اک جلوہ گہ پایا

ان عزیزوں کے سحر کاری نے / وہ دکھائے "طلسمی آئینے"

حواس میرے ہو گئے مسحور / کیفِ دیدار ہو گیا کافور

دیکھ کر میری چشم سحر زدہ — خود وہ بولیں نہیں یہ سحر کدہ
کیوں دماغ آپ کا ہے چکر میں — آپ پہ دل ہم آئے موڑ میں
آپ کے دوستان خوش محضر — کر گئے میرے دل میں آپ کا گھر
گھر ہے یہ آپ کا میں آپ کی ہوں — "نہ من افسونگرم نہ ایں افسوں"
یہ صداقت یہ خوشدلی یہ سرور — نہ تصنع نہ تمکنت نہ غرور

کہہ رہی ہے اب ان کی ہر خوبی
خود سری سے بری ہے محبوبی

نونہال

عشرت کا یہ زمانہ مسرت کا یہ ہجوم — شادی کا گھر برات کا دن نو بہ نو رسوم
پیر و جواں ہیں شاد، خوش اطفال بالعموم — ہر اک خوشی کے واسطے بچوں کا ہے لزوم

ہیں میمنت لزوم ان اطفال کے قدوم

پھوٹی کرن نشاط کی لالے کے داغ میں — چھلکی مئے طرب مرے دل کے ایاغ میں
گم اب مری بلا ہو خوشی کے سراغ میں — ہر قسم کی خوشی ہے مرے خانہ باغ میں

گھوم اے نگاہِ شوق اسی گلکدہ میں گھوم

ذوق و سرور و عیش کے ڈھب یہ جہاں کھائیں — ذوق و سرور و عیش وہاں کیوں سمٹ نہ آئیں
لطف و نشاط و کیف کا جب رنگ یہ جمائیں — لطف و نشاط و کیف نہ کیوں آپ مسکرائیں

آ اے نسیم مثلِ صبا ان کے پاؤں چوم

کس وقت کھیلتے نہیں یہ زندگی کا رنگ — ہنستے نہیں ہنسنے تو پھر اتنا کہ سب ہیں دنگ

آجائیں بلکہ مردہ دل ان کی ہنسی پہ تنگ سرخوش ہیں کتنے سن کے صدائے رباب و چنگ
آ اے صبا نسیم کی مانند تو بھی جھوم

ان کو خبر نہیں کسے کہتے ہیں احتیاط دل ان کا ان کے بس میں نہیں وقتِ انبساط
قبضے میں اپنے رکھتے ہیں سرمایۂ نشاط اپنے ہی ہم سنوں سے بڑھاتے ہیں ارتباط
ہے جانفزا انھیں کا نشاط آفریں ہجوم

زندہ دلی جو سادہ دلی کی ہے ہمعناں باجے جدھر بجے یہ ادھر ہو گئے رواں
رُخ ان کا ان کی سادہ دلی کا ہے ترجماں ہے ان کی بات بات سے اک سادگی عیاں
ہوجائیں یہ وہیں کے ادا ہوں جہاں رسوم

کرتا ہے ثابت اپنے تئیں کوئی منچلا جھک کر چلا کوئی تو کوئی اینڈتا چلا
پیر و جواں کی کیا نہیں نقلیں یہ برملا میری نظر میں ان کا ہر انداز ہے بھلا
حیراں ہیں ان کو دیکھ کے سب دیدہ ور نجوم

چہرے پہ ڈال لے کوئی حیرت فزا نقاب آپس میں کوئی بحث کرے ہو کے بے حجاب
اللہ یہ کسی کے نہ ہوں موردِ عتاب گر چشمِ آفتاب ہو تیز ان پہ ہو چھڑکے آب
برباد ہو جو آئے ادھر موجۂ سموم

ہر دم ہے ان کی شان نئے ڈھب سے جلوہ ریز طالب یہ امن کا وہ طلب گارِ رستخیز
آمادہ یہ ہے صلح پہ وہ مائلِ ستیز آواز اس کی ہو گئی دھیمی تو اس کی تیز
فی الحال نونہال مچانے لگے ہیں دھوم

رازِ وقارِ ملکی و ملّی ہیں نونہال جانِ بہارِ گلشنِ علمی ہیں نونہال
سرمایۂ نشاطِ حقیقی ہیں نونہال کیوں خوش نہ ہوں کہ رو بہ ترقی ہیں نونہال
ہو جائیں گے یہ وقت پہ دلدادۂ علوم

جون ۱۹۵۰ء

حاتم عصر ڈاکٹر حامد علی[لہ]

زندہ ہے یونہی کیا نام حاتم ۔ حاتم نما ہے پیغام حاتم
نیکی کئے جا پیغام اس کا ۔ زندہ نہ رہتا کیوں نام اس کا
تحسین آلیِ حسنِ عمل ہے ۔ اس کی سخاوت ضرب المثل ہے
پاس اس کے جو بھی محتاج آتا ۔ دل شاد رہتا خوش ہو کے جاتا
دیتا رہا وہ پاکیزہ گوہر ۔ کھانے کو روٹی آرام کو گھر
تن ڈھانپنے جو کپڑا نہ پاتا ۔ پوشاک اسے خود حاتم پنہاتا
دوشیزگانِ مفلس کی شادی ۔ اپنی طرف سے اس نے کرادی
آوارگانِ صحرا کو لاتا ۔ بستی میں اپنی لا کر بساتا
بھائی سمجھتا ہر آدمی کو ۔ ہر دم دلاسا دیتا دکھی کو
تجہیز و تکفین مُردوں کی کرتا ۔ آہیں بھی ان کی قبروں پہ بھرتا
تھے نیکیوں کے جتنے قرینے ۔ برتے سبھی اس مردِ سخی نے
الحاصل اس میں کوئی نہیں شک ۔ زندہ رہے گا یہ نام ابد تک
حاتم کے بعد اور آئے ہیں حاتم ۔ یہ سلسلہ ہے اب تک بھی قائم
معن اور یحییٰ فضل اور جعفر ۔ حاتم یہ چاروں انساں تھے یکسر
تاریخ داں جو ہیں جانتے ہیں ۔ ہر ملک میں کچھ حاتم ہوئے ہیں
خالی نہیں یہ ہندوستاں بھی ۔ حاتم ملیں گے دیکھو یہاں بھی

لہ دکن کے ایک نیکدل ڈاکٹر جنھوں نے اپنی عمر بھر کی کمائی قوم کی نذر کردی

محمود گاواں حاتم نہ تھا کیا　　احساں گناؤں میں اس کے کیا کیا
دسویں صدی کا وہ نیک انساں　　کہتے ہیں جس کو سب خانخاناں
حاتم سیر تھا حاتم اثر تھا　　بحرِ سخا کا یکتا گوہر تھا
مانا کہ موتی لال اب نہیں ہے　　یاد اس کی لیکن وجد آفریں ہے
ہم سب نے حاتم اس کو بھی مانا　　روشن ہے اس سے نہرو گھرانا
فی الحال حاتم حامد علی ہے　　نام اس کا دیکھو کتنا جلی ہے
اس پر نمایاں حال اور ماضی　　وہ قوم سے خوش قوم اس سے راضی
تھا اور ہی کچھ اگلا زمانہ　　ہے علم گستر اپنا زمانہ
ہمدردیوں کی حسبِ ضرورت　　جب اور صورت اب اور صورت
جب علم کم تھا اب علم وافر　　جب اور اب کا ہے فرق ظاہر
نفسِ سخاوت گرچہ وہی ہے　　طرزِ سخاوت لیکن نئی ہے
قومی فوائد ملکی مقاصد　　اب آ چکے ہیں تحتِ قواعد
حامد علی ہے فطرت کا بھیدی　　حقدار جو تھا دولت اسے دی
اس کو علی گڑھ ہو کیوں نہ پیارا　　پیارے وطن کا علمی ادارہ
شاہِ دکن جو بالغ نظر ہیں　　اس جامعہ کے خود چانسلر ہیں
یہ جاذبیت ہے اور کس میں　　قوم و وطن کی ہے روح اس میں
کل اپنی دولت قوم و وطن پر　　حامد علی نے کر دی نچھاور
یہ سیزدہ لک والا عطیہ　　پورا کرے گا علمی تہیہ

برکت ہو نازل حامد علی پر
ایثار ایسا اللہ اکبر!!

جنوری ۱۹۳۱ء

مجبوری کا عالم

بے ثباتی کا نقشہ دکھانا پڑا
غم کو لفظوں کی صورت میں لانا پڑا

کس کی چلتی ہے پیشِ قضا و قدر
آسماں کی طرف سر اٹھانا پڑا

تیرگی کے حوالے ہے نورِ نظر
خاک میں لختِ دل کو چھپانا پڑا

مجھ کو از بسکہ پیارا ہے نامِ حسنؑ
ایسے پیارے کا غم یوں اٹھانا پڑا

دیکھ کر جس کو اک عمر کی تھی بسر
اپنے گھر مجھ کو مجبوراً آنا پڑا

تعزیت کے لئے دوست آنے لگے
اپنے نزدیک سب کو بٹھانا پڑا

رو دیئے سن کے سب میری ناچاریاں
قلبِ مضطر کو قابو میں لانا پڑا

اے اجل کتنی بے لطف ہے زندگی
ہر خوشی سے مجھے ہاتھ اٹھانا پڑا

جس کی تابندگی تھی مرے رُخ کی ضو
گوشۂ قبر اس کو بسانا پڑا

غیر مرئی کو مرائی بنانا پڑا
مرثیہ اپنے ڈھب کا سنانا پڑا

اپنے مرحوم بچہ کا رُخ دیکھ کر
چاند کو داغ دل کا دکھانا پڑا

رو رہا ہوں میں ننھی سی اک قبر پہ
ہاں میں ہاں آسماں کی ملانا پڑا

نام رکھا تھا اس کا غلامِ حسن
قبر میں اپنے ہاتھوں سُلانا پڑا

قبر میں آہ تنہا اُسے چھوڑ کر
پھر غضب یہ کہ کھانا کھلانا پڑا

دیکھ کر مجھ کو آنسو بہانے لگے
دردِ دل دوستوں کو سنانا پڑا

وہ دلاسا وہ پرسہ وہ غمخواریاں
بن کے تصویرِ غم بیٹھ جانا پڑا

زندگی سے عبارت ہے شرمندگی
یعنی شرمندگی کو چھپانا پڑا

جس کی رخشندگی تھی مرے دل کی لو
اور گھر میں مجھے تلملانا پڑا

اپریل ۱۹۴۱ء

سوال ہے یہ نہیں ہے گالی

امیر زادے کا ہاتھ خالی! — یہ ہاتھ ہے یا ہے خشک ڈالی؟
خزاں زدہ نونہالِ دولت — نہالِ نوخیز و پائمالی!!
شکستہ بالی اس کو کہہ رہی ہے — خود اس کی سعیٔ فراغ بالی
کدھر ہے منظور دھیان تیرا — سنبھل اب اے رندِ لا اُبالی
یہ کیسے جملے ہیں سیدھے سادے — یہ کیسی باتیں ہیں بھولی بھالی
امیر زادے کی یہ بڑی گت — ہمارے حق میں ہے نیک فالی
اسی کے دادا نے چھین لی تھی — ہمارے جد کی شگفتہ حالی
مرے ہوئے مفلسوں کی مٹی — ہوس کے سانچے میں کس نے ڈھالی
ہمارے گھر اور کس نے ڈھائے — بنائے جور اور کس نے ڈالی
نہیں یہ اپنے سلف سے کچھ کم — نگاہ اس کی بھی ہے جلالی
وہی رعونت وہی شرارت — مذاق اس کا بھی ہے جدالی
غضب وہی ببر جنگ والا — کڑک وہی رعد جنگ والی
مگر وہ جاہ و حشم کہاں اب — نہ وہ اہالی نہ وہ موالی
بصد ادب اک سوال پوچھوں — سوال ہے یہ نہیں ہے گالی
غرور ظاہر ہے — بندہ پرور — ہنر بھی کچھ ہے — جنابِ عالی

کیا خُوب

پاک دل آئے مرا غنچۂ خاطر بھی کھلائے
"بدبطوں" آ کے بنائے حرم دل نہ ہلائے
جس کے پَرتو سے مرا آئینۂ دل ہو کثیف
کیوں وہ از راہِ کرم لائے مرے گھر تشریف
خاک ہو اس سے نہ ملنے کی تمنا پوری
زیورِ علم سے آراستہ ہے مجبوری
"علم رسمی" سے ہوں مجبور کچھ اب ایسا میں
"دل شکن" کا بھی تو دل توڑ نہیں سکتا میں

جس کے جلوہ کا ہوا اعلان ہی پیغامِ نشاط
چاہتا ہوں کہ وہ دے رو تو مجھے جامِ نشاط
چھیڑ بیٹھی ہے سمن تذکرۂ خوشش نسبی
میں نے پوچھا کہ سبب؟ کہنے لگی بے نسبی
ہائے اس ڈھب سے کہا بے نسبی کا فرنے
اس کے بے ساختہ پن کا میں لگا دم بھرنے
اتنی محسوس ہوئی لذت بے ساختگی
چٹکیاں دل میں ہر اک اس کی ادا لینے لگی
واہ وا واہ یہ کیفیتِ گفتارِ سمن

"دل من داند و من دانم و داند دلِ من"

لالۂ رخ ڈال کے شہناز کی گردن میں ہاتھ
آ گیا پھر ملاقات بڑے ناز کے ساتھ
ناپسندیدہ نظر آئی جو یہ بوالعجبی
میں نے پوچھا سبب اس سے تو کہا بے سببی
لالۂ رُخ نے بھی کہا بے سببی مثلِ سمن
لیکن انداز میں اس کے نہیں ساختہ پن
ایک ہی لفظ کبھی خوب کبھی ہے ناخوب
اپنی فطرت مجھے معلوم ہوئی اب کیا خوب

تحریک تگ و دو

دلدادۂ گردش ہیں زمانہ بھی زمیں بھی
رُکتے ہیں کسی وقت بھی؟ تھمتے ہیں کہیں بھی؟
قدرت نے لگایا ہے عجب راہ پر ان کو
دیکھا نہیں کب مہر نے گرمِ سفر ان کو
منزل کا نشاں راہ میں جن کی نہیں آتا
گیت ان کو ستاروں کے بھلا چاند سناتا!

حیران تھی کیا ان پہ اک آدم کی نظر بھی
ایں دم نے بھی دیکھا انھیں مصروفِ سفر بھی
دیکھو انھیں جب یہ نظر آتے ہیں مسافر
محشر ہی دکھائے گا انھیں منزلِ آخر
دم بھی کہیں لیتے نہیں کیا ذکرِ اقامت
مانوسِ اقامت انھیں کر دے گی قیامت
"رہوار" کہے گا نہ "عناں گیر" کہے گا
راز ان کے سفر کا فلکِ پیر کہے گا
ہیں مشتری و زہرہ و کیواں بھی سرِ راہ
کر دے گا کوئی ان کے سفر سے تمھیں آگاہ
بھید ان کی سیاحت کا ہے منجملۂ اسرار
گم سُم ہوں اگر دوسرے حیرت زدہ سیار
اس راز کو پوچھو کبھی مریخ سے تم خود
مریخ سے لرزاں ہو تو لو راہِ عطارد
کرتا ہے وہی ان کا سفر نامہ مرتب
تحقیق کرو ان سے کہ ٹھیرے ہیں یہ کب کب
خاموش عطارد ہو تو لو راہ قمر کی
روداد سنائے گا قمر ان کے سفر کی
آتے ہیں نظر کیا کہیں ایسے بھی سُبک رَو
محسوس تمھیں خود نہ ہوئی ان کی تگ و دو

ممکن ہے مری بات نہ آئے تمہیں باور
خیر ۔۔۔ ابر میں رُوپوش نہیں خسرو خاور
یہ دیدہ ور اس بات کی تصدیق کرے گا
نسخہ تمہیں اک ان کے سفرنامہ کا دے گا
کیا تم کو علاقہ نہیں کچھ ان کے سفر سے
گھر قبر ہے کیا؟ تم جو نکلتے نہیں گھر سے
لیٹے ہوئے سوئے ہوئے کھوئے ہوئے تم ہو
اٹھو ابھی، کیا موت کی آغوش میں گم ہو
بیٹھے ہو ثوابت کی طرح بن کے اپاہج
"سیار جماعت" تو نہیں راہ میں حارج؟!

فروری ۱۹۵۲ء

ایک ہندستانی گریب کی بڑبڑاہٹ

ٹھانو نہ پاؤں دیس کے اندر جینا چاہوں بھوکوں مر کر
ڈالی جیسے کانپوں تھر تھر دھرتی جیسے کھاؤں چکر
پُردا جیسے گھوموں گھر گھر، بیت گیا دن یونہی مجھ پر
جاگ اٹھا من موہن چندر بھوکا ہوں میں سوؤں کیونکر
بھُول گیا سب جنتر منتر سونا سونا ہے من مندر
امبر ہٹن برسا دے امبر دو بھر ہے اب جینا دو بھر

روپ بھون میں جادو ٹونا جادو ٹونا روپ کھلونا
یاں بھی سونا واں بھی سونا جوت جگائے کونا کونا
مجھ کو آیا سدھ بدھ کھونا رو کر ہنسنا ہنس کر رونا
بوجھ اپنی آشا کا ڈھونا آنسو نکلیں تو منہ دھونا
میری بھوکی بپتا سن کر ہنستا ہے ان داتا مجھ پر
امرت ہنس برسا دے امبر دو بھر ہے اب جیون دو بھر
ان داتا سے توڑوں ناتا کام نہیں ہے یہ من بھاتا
میری دھن میں بھارت ماتا دھیان ہیں اس کے اپنا "کھاتا"
مورکھ ہے یہ شوم ان داتا کیوں اپنوں کو دھیان میں لاتا
روپ بھون میں کیوں میں جاتا روپال کیوں میرے گھر آتا
تارے ہنس دیں جب مورکھ پر ان داتا دہ بانچے کیوں کر
امرت ہنس برسا دے امبر دو بھر ہے اب جیون دو بھر
ناری پائی سندر چنچل آپ بھی ہنس مکھ ہے "روپال"
داس اور داسی لے آئے پھل پھل میٹھے میٹھا گنگا جل
سنساران کا کومل کومل سوکھی سوکھی میری چھاگل
بھوک کے مارے ہوں میں بے کل رکھ لے کالے کالے بادل
گوری گوری بجلی ہنس کر چمکے دے کیوں میرے من پر
امرت ہنس برسا دے امبر دو بھر ہے اب جیون دو بھر

جون ۱۹۳۵ء

استفہامِ انکاری

(۱)

کیوں شیر دلو اس کی قیادت ہے گوارا
جو کر نہ سکے خوف سے کرکٹ کا نظارا
سینہ سپر آفات میں ہوتا نہیں بزدل
تخریبِ دماغ آئے گی کیا کام بجز دل؟!

(۲)

کیوں ذی اثر و رنگ جمائے وہی اپنا
آئے نہ جسے آتشِ احساس میں تپنا
گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے جو خود کام
کیا اُس کا تلوّن بھی نظر آئے خوش انجام؟!

(۳)

کیوں ہم وطنو قوم و وطن کا وہی ضامن
یکساں نہیں جس "زر زدہ" کا ظاہر و باطن
طعمہ نہ بنا دیں اسے کیوں زاغ و زغن کا
دشمن ہے جو ہر ایک ہوا خواہِ چمن کا

(۴)

کیوں خوش نظر و مجد و شرف کا وہ نگہدار
طامع جسے کہتے ہیں دل افروز سپہدار

زر دار نظر دوختہ معیارِ شجاعت ؟!
طماع جگر سوختہ حق دارِ قیادت ؟!

(۵)

کیوں ہم سفرِ قافلہ سالار وہی ہو
معلوم نہ ہو منزلِ مقصود ہی جس کو
سختی کوئی آرام طلب سہہ نہیں سکتا
بے شیشہ و ساغر کبھی خوش رہ نہیں سکتا

(۶)

کیوں ہم سخنو شان میں اس کی یہ قصاید
دل جس کا ہے نامحرمِ آلام و شداید
دل باختہ چاہیں جسے تم اس کو نہ چاہو
غدار کا گھر امنِ اربابِ وفا ہو ؟!

جون ۱۹۵۰ء

برادری کا لحاظ بیمار کو بھی ! ۔ اللہ اللہ

بخار نے مرا عالم ہی اب بدل ڈالا
کراہتا ہے بصد یاس مجھ سا متوالا

مزا زباں کا کیوں کر کہوں میں کیسا ہے
برادرم ! ابھی کڑوا تھا ۔ اب کسیلا ہے

دئیے بخار کی غیظ آفریں تجلی نے
بیک نظر کئی ہیبت فروش آئینے

میں دل کا آئینہ ہر آن دیکھنے والا
یہ آئینے مری دنیا کریں تہ و بالا !

کہوں بخار میں کیا اپنی وحشتوں کا مآل
خیال ہی وہ نہ آیا جو بن سکا نہ ملال

عزیز تک نظر آتے نہیں عزیز مجھے
بھلا عزیز ہو کیا کوئی ان کی چیز مجھے

یہ لوگ میری عیادت کی خاطر آتے ہیں
پسند تھے جو مجھے ایسے میوے لائے ہیں

یہ پیکٹ آم کا ہے وہ انار کا بنڈل
میں کھو رہا انھیں کیا ہیں حواس ہی مختل

مرے لئے اتنا بس آج کوئی تو لاتا
ابھی منگاؤں گا یہ پھل ہے میرا من بھاتا

مجھے تو ان کی کوئی چیز بھی پسند نہیں
یہ لوگ رسم کے بندے ہیں درد مند نہیں

کوئی بسورتا ہے کوئی منہ بناتا ہے
سرہانے بیٹھے کوئی مغز کھائے جاتا ہے

مزاج پوچھا دعا دی کیا سلام ٹلے
نہ یہ کہ تب جیسے دل اُٹھے وہ ان سے اور ٹلے

میں ٹال دوں انھیں باہر سے اتنی تاب غلط
برادری کا ہے "سخت جاں" عتاب غلط

بُلا رہا ہوں انھیں پھر بھی ہیں یہ ناچاری
بڑھا رہے ہیں جو پرسانِ حال بیماری

جون سنہ ۱۹۴۶ء

موجودہ تقاضے

(۱)

اعلان ہو جدّت کا سرنامۂ خمخانہ
میخوار پڑھیں فرفر "مبہم" خطِ پیمانہ

لے پیرِ مغاں اپنی آگے نہ بڑھائے خود
جب تک نہ کرے اس کی تائید کوئی بے خود

رندوں میں نظر آئے وہ یکدلی خوش کن
لے لے کے اثر جس سے سب گائیں انھیں کے گن

(۲)

"نو طرز" بتوں سے ہو آرائشِ بتخانہ
فرسودہ رواجوں سے بُت گر بھی ہو بیگانہ

اصنام رواں دعوت دیں ایسی پرستش کی
جس میں نہ ہو گنجائش خودساختہ نازش کی

انوارِ تجدد سے خوش جملہ پجاری ہوں / پارینہ روایت کے ادراک سے عاری ہوں

(۳)

تھی جہل کے برقعہ میں "بجلی" کی قدامت جب / بے پردہ مشینوں میں بجلی کی ہے جدت اب
اب قہر صفت بجلی پیمانۂ رحمت ہے / یہ بات ہے افسانہ یا صاف حقیقت ہے؟
اندازہ وہ کیسا تھا؟ فی الحال ہے ڈھب کیسا؟ / مٹی کا دیا ویسا! بجلی کا چراغ ایسا!!

(۴)

چلتے نہیں کیوں چھکڑے؟ کیا تھک گئے بچارے؟ / ہیں قہقہہ زن ان پر کس شان سے طیارے
ٹھم ٹھم کے ٹھُدکتی ہیں کیا سانڈنیاں اب بھی / سڑکوں پہ بسوں نے کب ان کی بھی جگہ رکھی
رتھ رینگ چکا صدیوں اب دوڑتی ہیں ٹیکسی / درماندہ سواری سے یہ برق سیر کھیلیں!؟

(۵)

آثارِ کہن کیا ہیں؟ عبرت کے نمونے ہیں / تاباں نہیں مدھم ہیں دلکش نہیں سُونے ہیں
آثارِ کہن کی حد ہر آن جو میں تکتا / یہ نخلِ طرب میرا ہرگز نہ پنپ سکتا
فی الحال میں حسن کو بھی ہم دولہ پاؤں گا / ان حوصلہ مندوں کو جوش اپنا دکھاؤں گا

(۶)

زیبا ہے مجھے اپنا اندازِ سخن گوئی / پروا نہ کروں بالکل خوش ہو کہ خفا کوئی
میں سر پہ جگہ دے کر ماضی کی بیاضوں کو / برتوں گا نئے ڈھب سے موجودہ تقاضوں کو
حاضر پہ بھلا کیوں کر غائب کا پڑے پرتو / فرسودہ تفکر سے شاداب ہو فکرِ نو؟!

غزلیات

(۱)

باتوں میں ہے جدّت بھی جدّت میں ہے لذّت بھی
اس حُسنِ تکلّم پر تم کو نہیں حیرت بھی؟!
بکھرے ہوئے جلوے تو دیکھے ہیں سرِ محفل
اے کاش کبھی دیکھوں ہنستی ہوئی خلوت بھی
گرویدہ ہے میرا دل اس دقت شناسی کا
بر وقت شرارت بھی موقع پہ متانت بھی
کیوں تھام نہ لیں دامن اس پیکرِ خوبی کا
آغازِ محبّت بھی انجامِ محبّت بھی
اب دیدہ و دل میرے پائیں گے مزے کیا کیا
وہ حُسنِ مجسّم ہے اب مائلِ زینت بھی!
ساقی کی نگاہوں سے کیفیتِ روز افزوں
اک دن بھی نہ مانگوں میں؟ کیا حسبِ ضرورت بھی
کھویا ہوا دل ہی کیا لیتا ہوں ترے ہاتھوں
بنتی ہے ترے ہاتھوں بگڑی ہوئی قسمت بھی

خوش ہوں کہ نہ ہوں میری دیدارطلب آنکھیں
بن جائے گا افسانہ کیا نورِ حقیقت بھی

برسات کا موسم بھی کہتا ہے کہ کچھ کہیئے
فی الحال بہاروں پر ہے میری طبیعت بھی

چول چوں کا مرکب ہیں اس دَور کے مولینا
صورت گرِ ملت بھی! غارت گرِ ملت بھی!!

پیری و جوانی کی دکھلا کے ہم آہنگی
کیا شیخ نہیں کرتا دعوائے کرامت بھی؟!

لُوٹے نہ مزے کیوں کر زردار کے قبضے ہیں
حوریں بھی ہیں غلماں بھی نہریں بھی ہیں جنت بھی

بد خو بھی بشر ہیں کچھ، خوش خو بھی ہیں کچھ انساں
منظور ہے، کار آمد "نفرت" بھی "محبت" بھی

اکتوبر ۱۹۵۳ء

کسی کی نظم کا "جواب" لکھنا اور تفاخر جتانا، کسی کی غزل پر غزل کہنا اور اپنے تئیں بزرگ بتانا مجھ کو آیا ہی نہیں۔ یہ غزل اپنے ایک "مشاعرہ دوست" دوست کی خاطر کہی، حوالہ اس لئے دیا کہ بوقت تحقیقات اوپر والا دعویٰ مدلل ہو جائے ــــ اب

سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

ایسی غزلیں شاید اور بھی کچھ ایں، شاید نہیں، ضرور ملیں گی۔ لیکن کہیں آپ یہ فرما نہ سکیں گے کہ غالؔی منظر تصرف زور آزمائی ہے۔ ۱۲

خاص پہلو

غزلِ مسلسل

تری بھول کا نہ کرتا کبھی بھول کر گلہ میں
ترا دلربا ادا نہ اگر اور دیکھتا میں

یہ نئی ادا نکالی کہ بنائے پردہ ڈالی
پس پردہ چھپنے والی نہیں تجھ پہ کیا فدا میں

تری بے رخی کے صدقے دبی اب یہ رخی دکھا دے
تب و تاب بیدلی سے نہیں اب آ گئی تمنا میں

وہ بہار خیز جلوہ وہ نشاط ریز لمحہ
مجھے یاد ہے رہے گا ارے اس کو بھولتا میں

وہ معاملہ وہ عالم وہ ہنسی مذاق باہم
کبھی تو نے کہدیا "ہم" کبھی ہنس کے کہدیا "میں"

مری شانِ جبہ سائی ترے آستاں پہ چمکی
ترا مدعا ہے تو ہی نہیں اپنا مدعا میں

تری ساقیانہ فطرت مجھے دے رہی ہے پیو
تری دلکشی سلامت ابھی کیوں نہ جھومتا میں

ترے دونوں لب ہیں ساغر ترا ہر سخن اک افسوں
اثر اب بھی لے رہا ہوں تری بات بات کا میں

مری زندگی کا نقشا تری بندگی سے بدلا
ترا نام اگر نہ جپتا تو کسے پکارتا میں

اثرِ وفا ہو زائل؟ نہیں، ہے یہ سخت مشکل
تجھے چاہتا مرا دل تجھے بھولتا بھلا میں

تجھے نفرت اس سے ہو تو مجھے کیوں یہ آرزو ہو
کہ دکھائے جاؤں تجھ کو یونہی اپنا حوصلہ میں

ترے سحر پاش جلوے مجھے یاد اگر نہ ہوتے
یونہی اپنی حسرتوں سے ابھی اور کھیلتا میں

پس پردہ اے پری رو جس ادا سے چھپ گئی تو
اس ادا کا "خاص پہلو" نہ سمجھ سکوں گا کیا میں

جولائی ۱۹۵۳ء

(۳)

خوش نہیں، غمگیں نہیں، مغموم نہیں، مائل نہیں
کچھ برائے نام بن جانے کا میں قائل نہیں

ولولے، ارماں، امیدیں، آرزوئیں، حسرتیں
کاروانِ دل ہے ـ میر کاروانِ دل نہیں

شغل کیسا؟ ذکر کس کا؟ علم و یکسوئی کے بعد
رات دن کیا اب بھی میں ہوں فکر و شاغل؟ نہیں

کیا نہیں اعلان عزمِ عشق مرگِ کوہکن
اب بھی جاں پر کھیل جانا سہل ہے مشکل نہیں

میرے ہنس مکھ چاند کیا تیرے فسانے کیلئے
طورِ برقِ جلوہ و طورِ جہانِ دل نہیں؟

ذوق بے شوق ایک دعوٰی شوق بے ذوق اک مجاز
شوق کی منزل کے آگے ذوق کی منزل نہیں

چھیڑ چھیڑے دل نشیں در پردہ سازِ انبساط
مست کر دینا مجھے تیرے لئے مشکل نہیں

بندہ پرور! وہ ملاقاتیں وہ راتیں اب کہاں
آپ بھی ہشیار ہو گئیں، میں بھی اب غافل نہیں

میرے قبضہ میں ہے پورا چشمۂ آبِ حیات
حاصلِ سعیِ تمنا بحرِ بے ساحل نہیں

بحثِ نقصان و زوال اے ماہ کامل چھیڑ کر پھر
خامیاں تجھ میں بھی ہیں کچھ، تو بھی کامل نہیں

مٹ گئی دل سے تمہارے چشمِ رحمت کی امید
کیا محبت کا اثر بھی ہو گیا زائل؟ نہیں

گاہے گاہے میں بھی کر لیتا ہوں تازہ ان کی یاد
جو منافق دوست میری یاد سے غافل نہیں

یہ بھی قابل وہ بھی قابل سب ہیں قابل بزم میں
ذکر یاں منظور کا! منظور اس قابل نہیں

مارچ سنہ ۱۹۵

(۴)

کھیلا کئے تری نگہِ فتنہ گر سے ہم
فتنے اُدھر سے آئے تو دوڑے اِدھر سے ہم

سمٹی ہوئی ہیں دل میں دو عالم کی وسعتیں
جھجکیں نہ کیوں تری "طلبِ مختصر" سے ہم

اچھا بُرے بھلے کا نہیں ہم کو امتیاز
دیکھیں اب اپنے دل کو بھی تیری نظر سے ہم

دے گی جواب اس کا ہماری جبینِ شوق
مانوس کس قدر ہیں ترے سنگِ در سے ہم

او شوخ چشم حُسنِ توجہ سے کام لے
کیوں مطمئن نہیں ابھی دردِ جگر سے ہم

سُلجھا رہے ہیں کاکلِ شامِ فراق کو
اُلجھیں گے کیا ہجومِ شعاعِ سحر سے ہم

گلہائے خُشک نے ہمیں مایوس کر دیا
مانوس ہو رہے تھے گلِ تازہ تر سے ہم

نزدیک اِدھر سے ان کا ہے گھر یا اُدھر سے ہے
نکلے یہ سوچتے ہوئے آج اپنے گھر سے ہم

دل ہے ہمارا آئینۂ جلوہ زارِ دوست
ہم سے سحر ہے شاد تو خوش ہیں سحر سے ہم

منظور کیوں نظر سے یہ تارے ہمیں گرائیں
سرشار کیا نہیں ہیں کسی کی نظر سے ہم

مئی ۱۹۵۴ء

(۵)

عشق کا حسن ہم جماعت ہے — دوست یہ معتبر روایت ہے

قہقہے ہیں غرورِ حسن کی ضد — مسکرانے میں کیا قباحت ہے

سب حسیں ہیں شریر کس نے کہا — بندہ پرور یہ کیا شرارت ہے

باور اب بھی نہ آئے جذبِ نظر — یہ نظر ہے؟ نہیں کرامت ہے

عام ادائیں بھی دلربا ہیں مگر — "خاص ادا" انکی خاص جدت ہے

وہ سمجھنے لگے زبانِ حال — لب کشائی کی کیا ضرورت ہے

شکوۂ جور میں کروں! توبہ — ان کی آنکھوں میں کیوں ندامت ہے

دردِ دل میں سناؤں، وہ پوچھیں — یہ فسانہ ہے یا حقیقت ہے

قدرِ صبحِ وطن کی آج ہوئی — کیا بھیانک یہ شامِ غربت ہے

میں نے کیا کیا قیامتیں دیکھیں — کون اب منکرِ قیامت ہے

مٹ گیا درد رہ گئی لذت — خیر جو کچھ بھی ہے غنیمت ہے

وہ بتِ فتنہ قامت آپہنچا — ہاتھ میں دامنِ قیامت ہے

کس کو حسنِ بشر ملا پورا — چاند سورج میں کچھ شباہت ہے

ذوق و وجدان دیدہ ور ہیں گواہ — حسنِ کثرت جمالِ وحدت ہے

بت بھی اپنی زباں میں کہتے ہیں — حسن کی جان آدمیت ہے

شرطِ طاعت بجان و دل منظور
کیفِ عرفاں بقدرِ طاعت ہے

---

(۶)

نظر آتے ہیں نظر آئے ہوئے خواب، یہ کیا
شوقِ تعبیر میں ہوں پھر بھی میں بیتاب، یہ کیا

جاں نثاروں کے لئے، ساغرِ زہراب، ستم
بے وفاؤں کو ملے جامِ مئے ناب، یہ کیا

رنج سہنے کے لئے ربط بڑھایا تو نہ تھا
ہے مری جان کا دشمن غمِ احباب، یہ کیا

لبِ دریا کو ابھی چوم رہی ہے کشتی
دھمکیاں دینے لگا ہے مجھے گرداب، یہ کیا

رازِ سربستۂ محبت کا کرشمہ نہ سہی!
دلِ آتش زدہ و دیدۂ پُر آب، یہ کیا!

سوز، پُر کیف کبھی تھا، وہ زمانہ نہ رہا
ساز سننے کی بھی مجھ میں نہیں اب تاب، یہ کیا

رات بھر جاگ کے سو جاتے ہیں تارے، دن بھر
رات دن میں رہوں بیتاب ہی بیتاب، یہ کیا

ہم نشیں! دیکھ مری بے سروساماں دنیا
کھو رہا ہوں میں اسے عالمِ اسباب، یہ کیا

کائناتِ دلِ اخلا گشتہ ہی جاتی ہے
میری آنکھوں سے تو جاری نہیں سیلاب، یہ کیا

کیا مجھے خون رلانے کو بہار آتی ہے
چشمِ حسرت زدہ یوں شرم سے آب آب، یہ کیا

جشنِ نوروز کو ایامِ مصیبت سے غرض
راتِ فرقت کی دکھائے طربِ خواب، یہ کیا

نہر کے اس طرف احباب کئی جا پہنچے
میں جب آیا نہ رہی نہر بھی پایاب، یہ کیا

شامِ غربت کا مجھے آئے بلاوا منظور!
دعوتِ عیش تجھے دے شبِ مہتاب، یہ کیا

جون سنہ ۱۹۴۵ء

(۷)

جب ادا دل نے سپاسِ لبِ گفتار کیا
میں نے کیفِ دمِ سربستہ کا اظہار کیا

یادِ احسانِ ازل ہی سے گراں بار تھا میں
خوشِ نظرِ دوست نے آج اور گراں بار کیا

یہ خموشی بھی ہے گویا جرسِ بیداری
بحمدالحمد — بتوں نے مجھے ہشیار کیا

اُف ری عادت، وہی پیمانہ و پیماں شکنی
جرمِ پیماں شکنی آج کئی بار کیا

عشق وہ سحرِ مسلسل ہے کہ پیہم جس کا
مَیں نے اقرار کیا دوست نے انکار کیا

آبرو کھو کے رہی چشمِ گہر بار اپنی
اس نے رُخ بھی طرفِ چشمِ گہر بار کیا

واہ خودکام ہے خورشید سا بھی فیض رساں
خود تو بیدار ہوا مجھ کو نہ بیدار کیا

اور کیا ہے یہ تری کم سخنی ہے اے دوست
دل لگی سے مجھے جس بات نے بیزار کیا

سازشِ اصنام سے کی چپ مجھے کرنے کیلئے
اپنی ہی چشمِ سخن گو کو نہ تیار کیا

کم نگاہی مری کس کس کا تعاقب کرتی
کیا خبر مجھ پہ کن احباب نے کب وار کیا

کم نظر آئے نظر مہر سے ہر صبح خجل
اپنے دل کو بھی کبھی مطلعِ انوار کیا

ماجرائے زرِ گل اور یہ حاتم سیرت
کیا کیا — کیا کسی نادار کو زردار کیا

دیدیا دل سرِ رہ، جان نہ دی منزل پر
شرم کی بات ہے، یہ بھی کوئی ایثار کیا

سو نہ جائے کہیں یہ سوئی ہوئی سی پُرفن
میں نے دنیا کو اسی خوف سے بیدار کیا

فتنہ گر چیز تھی — جس چیز کو مخفی رکھا
کام کی بات تھی — جس بات کا پرچار کیا

یہ غزل دیکھ کے منظور احسن منہ نہ بنائیں!!
تم نے باندھا ہے کسی شعر میں بھی پیار کیا!؟

اکتوبر ۱۹۴۹ء

(۸)

کیا کہوں ناسمجھ احباب نے کیونکر دیکھا
کلمہ پڑھ کے جمالِ بُتِ کافر دیکھا

اب بھی اپنے تئیں خوش بخت کہوں یا نہ کہوں
مَیں نے یہ جلوہ بتائیدِ مقدر دیکھا

جس کی تھی دل کو تمنا وہی صورت دیکھی
جس کی نظروں کو طلب تھی وہی منظر دیکھا

جذبۂ دل پاس ہیں وہ اُن سے کہوں پوچھ نہ لوں
کیا وہی تم ہو جنھیں خواب میں اکثر دیکھا

جم گیا دھیان انھیں کا وہی انصاف کریں
سرسری دیکھ لیا ہے کہ سمجھ کر دیکھا

چشمِ سرشار نے ان کی یہ دکھایا اعجاز
سامنے اپنے چھلکتا ہوا ساغر دیکھا

دیدیا تھا جنھیں دل دیکھ کے "دم بھر" میں نے
آج پہروں انھیں خلوت میں بٹھا کر دیکھا

کبھی کردار کو جانچا کبھی تیور دیکھے
کبھی ملبوس کو پرکھا کبھی زیور دیکھا

نظم پڑھ پڑھ کے چمکتے ہوئے گوہر دیکھے
گیت گا گا کے دمکتا ہوا جھومر دیکھا

انگلیاں دیکھ کے نازک سی کلائی دیکھی
لے کے زلفوں کی بلائیں رُخِ انور دیکھا

سچ ہے دیکھا انھیں اس طرح کہ وہ جھینپ گئے
چھیڑ کی پھر سے انھوں نے تو مکرر دیکھا

حورِ فردوس تو فردوس میں آئے گی نظر
رشکِ حور کو پاس اپنے زمیں پر دیکھا

مجھ کو منظور یہ جلوہ ہے ادھر دیکھے کون
میں نے کب چہرۂ خورشید گھڑی بھر دیکھا

فروری ۱۹۵۲ء

(۹)

ہے میری وفا پہ خندہ زن دوست
دل خاک بڑھائے دل شکن دوست

کیوں چاند جگا رہا ہے جادو
میرا بھی ہے ایک سحر فن دوست

اب "نغمہ گری" ہے امرِ فطری
نیچر کی عطا ہے گلبدن دوست

ہے فرض پرستش اس کی مجھ پر
بُت میرے لئے ہے کم سخن دوست

یہ ہوا بھی غضب خدا کا
یزداں طلب اور "اہرمن دوست"

انسان ہیں بھانت بھانت کے یاں
زر دوست، زمین دوست، زن دوست

افراط ہے ایسے دوستوں کی
کم لوگ وطن میں ہیں وطن دوست

شاعر نہ وطن کا گیت گائے!
بُلبل تو ہو فطرتاً "چمن دوست"

دھوکا یہ نہیں تو اور کیا ہے
جملہ ارکانِ انجمن، دوست

وہ دوست یہ دوست، توبہ توبہ
ملتا ہے کہاں جنابِ من! دوست

پیماں شکن اجنبی سدھارے
جی بھر کے لڑیں گے ہم وطن دوست

تلخی کا ہے راز "حسنِ شیریں"
آپس میں ہیں شیخ و برہمن دوست

ہیں شور فگن صباحتیں بھی
خوش وضع ہیں کتنے بدچلن دوست

دل میرا بڑھا رہے ہیں گویا
منظور یہ حوصلہ شکن دوست

اکتوبر ۱۹۴۶ء

(۱۰)

مانعِ فریاد وہ خود بھی نہیں، فریاد کر — لیکن اے منظورؔ یاد اچھی ہے، ان کو یاد کر

یاد ان کی بے نتیجہ ہو نہیں سکتی کبھی — یاد ان کی بے نتیجہ ہو تو پھر فریاد کر

تو نے بنیادِ محبت ڈال دی، اچھا کیا — لے کے نام اللہ کا مضبوط یہ بنیاد کر

اس سہی قد کا تصور دل میں جم جانے تو دے — بعد اس کے شوق سے نظارۂ شمشاد کر

تو بھلا دے غیر کو جتنا بھلایا جا سکے — یاد جتنا کر سکے دلبر کو اپنے یاد کر

ماہِ نو لیتا ہے ان کے ہر نئے جلوے سے نور — خود کو ماہِ نو کی رسمی دید سے آزاد کر

حور و غلماں بھی حسیں ہیں، حسن کا منکر نہ بن — لیکن انساں ہے تو قدرِ حسنِ آدم زاد کر

سیکھ اپنے ہمدمِ یکدل سے ہنسنا بولنا — کون کہتا ہے کہ لطفِ زندگی برباد کر

دل میں غیر آ جائے تو موجودہ ویرانی بھلی — اپنے ویرانے کو اپنے دوست سے آباد کر

جن حسینوں کی نظر دل پر ہے، پر اُن میں نہیں — شاد ہوں یہ جان بھی۔ اگر تو ان کو شاد کر

دہمِ غم، وہمِ طرب، وہمِ ستم، وہمِ کرم — دام ہیں سب، خود کو ہر اک دام سے آزاد کر

ان سے وابستہ ہو تیرا ہر سکوں، ہر اضطراب — یاد کر ان کو سنبھل کر، یا تڑپ کر یاد کر

قصۂ فرہاد و شیریں! واہ اے منظورؔ واہ!!
نظم اپنی اور اپنے دوست کی رُوداد کر

جنوری ۱۹۵۲ء

(۱۱)

ہاں، کہہ تو دیا تھا نگہہ دوست کو مینوش
کس وجہ سے کس دن یہ کہا تھا نہیں اب ہوش

سونپے کسے پھر زندہ دلی بارِ محبّت
ہو مجھ سا اگر انبارِ محبّت جو سبکدوش

بڑھ جائے نہ کیوں دلکشیٔ شکوۂ بے جا
شکوہ تو ادھورا ہی رہا، ہو گئے خاموش

کیوں ساقیٔ گل چہرہ کہاں کا ہے یہ انصاف
مینوش تہیدوش! افضا میکدہ بر دوش!

حُسنِ طرب انگیز کا خود ہے یہ کرشمہ
مجھ سے بھی وفاکیش کو سمجھے وہ طرب کوش

کھلتا نظر آتا ہے مرا غنچۂ خاطر
ہنستے نظر آتے ہیں سمن پاش سمن پوش

رُخ پھیر لیا چشمِ سخن گو کا ادھر کیوں
کچھ اور گلے کر لیں ابھی ہوں ہمہ تن گوش

چلتے ہوئے فقرے ہیں محبت کے تقاضے
میں کر نہ سکوں گا ترے فقروں کو فراموش

پورے چمنستان کے یہ سمٹے ہوئے جلوے
یوں شبنمِ شاداب گلِ تر کی ہم آغوش

گلشن میں صبا روز یہ گاتی ہوئی آئی
اک لہر میں دو وصف۔ کہیں نیش کہیں نوش

اچھا۔ یہ صلائے کرم و رند نوازی
بہتر۔ یہ جہانِ طرب و بادۂ سرجوش

منظور سمجھتا رہے سرکار کی چالیں
سرکار سمجھتے رہیں منظور کو بے ہوش

اگست ۱۹۴۶ء

(۱۲)

آثارِ جلوہ گاہ جدھر پا رہے ہیں ہم
سجدے اسی جہت میں کیے جا رہے ہیں ہم

سرمایۂ نشاطِ تصور وہی تو ہیں
جی اور کس کی یاد میں بہلا رہے ہیں ہم

انسان ہو کے چشمۂ حیواں پہ جائے کون
آبِ حیات گھر میں پیے جا رہے ہیں ہم

ہو ہو کے ان کی چشمِ سخن گو سے بہرہ مند
دل کا پیام آنکھ سے پہنچا رہے ہیں ہم

ہے جانفزا معاملۂ دید و بازدید
یوں ان کو راہ راست پہ لے آ رہے ہیں ہم

آتش صفت بہار نے گرما دیا ہمیں
دورِ خنک مزاج کو گرما رہے ہیں ہم

ہے ہے وہ کافرانہ ادائیں وہ رنگ ڈھنگ
ایماں بتانِ شوخ پہ اب لا رہے ہیں ہم

اندازۂ کیفِ جلوۂ ساقی کا لگ چکا
مستوں کو دیکھ دیکھ کے لہرا رہے ہیں ہم

فہمِ فریب خوردہ نے سرشار کر دیا
سمجھے نہیں جسے اسے سمجھا رہے ہیں ہم

صبحِ ازل کی شرط نہ شامِ ابد کی قید
جلووں کے سلسلے میں بہے جا رہے ہیں ہم

ذوقِ طوافِ کعبہ یہاں اور بڑھ گیا
کس نے کہا کہ دیر میں پچھتا رہے ہیں ہم

رو رو کے جس کی بزم سے اٹھنا پڑا تھا کل
ہنس ہنس کے آج اس کی طرف جا رہے ہیں ہم

سن لیں گے تیری نظم بھی فرصت اگر ملے
منظور! اب تو اپنی غزل گا رہے ہیں ہم

دسمبر ۱۹۴۹ء

(۱۴)

خواہش ترا گھر دیکھنے کی بھی نہ کروں میں!
بہتر ہے — ترے ساتھ ہی کچھ دور چلوں میں؟

دیدار دل افروز تصور طرب اندوز
اے حسن کے شہکار تجھے داد نہ دوں میں!

خوشتر وہ کہوں تجھ کو مری جان! بہت خوب
تجھ سا بھی حسیں اور ہے؟ نام اس کا سنوں میں

حاصل ہو مہ و مہر کو یوں تیرا قدمبوس
تلووں سے ترے اپنی ہی آنکھیں نہ ملوں میں

میں شاد ہوں تو شاد ترا میکدہ آباد
کب میں نے کہا کس سے کہا غمزدہ ہوں میں

وہ گلکدہ یہ میکدہ وہ دور نہ یہ دور
ساقی تری صحت کا کہاں جام پیوں میں

چھیڑا ہے صبا نے انھیں، یہ ٹھیک ہے لیکن
برہم تری زلفیں ہوں! پریشاں نہ ہوں میں!!

ہو نام ترا وردِ زباں نیند جب آجائے
لوں نام ترا نیند سے جس وقت اٹھوں میں

پاس اپنے بلانا ہو تو کردے مجھے خوش حال
کیا آؤں ترے سامنے با حالِ زبوں میں

بھیجوں گا ترے نام میں گھر سے گلہ نامہ
خاکم بدہن تیرا گلہ تجھ سے کروں میں

بن جاؤں وفا خود ہمہ تن، پھر بھی کسی سے
روداد وفا کی نہ سنوں میں نہ کہوں میں

کم بخت ہوں میں — خیر، کیا پھر مجھے کیوں یاد
چھوڑ دیں مرا نام مروں میں کہ جیوں میں

کہنے مرے سرکار کی بات ہے منظور
شکوہ نہ کریں آپ، شکایت نہ کروں میں

جولائی ۱۹۵۰ء

(۱۴)

ممنونِ جلوۂ دلِ بیدار کون؟ میں
مفتونِ شیوۂ لبِ اظہار کون؟ میں

ہے چاند بھی گواہ ستارے بھی ہیں گواہ
سب لوگ محوِ خواب ہیں بیدار کون؟ میں

کس دل سے سرد مہریِ دلبر کا دوں جواب
کیا خوب! وقفِ آہِ شرربار کون؟ میں

کانٹوں میں دامن اور الجھتا چلا تو کیا
مشتاقِ سیرِ گلشنِ بے خار کون؟ میں

ہوتا میں تنگدل تو نہ ہوتا یہ میرا حال
پھر بھی ہوں شاد۔۔۔ صاحبِ ایثار کون؟ میں

استغفر اللہ ۔۔۔ مجھ کو تمنا خطاب کی!
توبہ کرو ۔۔۔ ثناگرِ سرکار کون؟ میں

مایوسِ مہربانیِ اغیار، میرا دل
مانوسِ بدگمانیِ اغیار کون؟ میں

اپنی متاعِ معرفت اپنوں کو سونپ دی
یہ کام عقل کا ہے تو ہشیار کون؟ میں

بے اختیار نخل ہے بے اختیار شاخ
بے اختیار برگ ہوں ۔ مختار کون؟ میں

زردار پھول ہی نہیں زرخیز باغ میں
غنچے بھی زربدست ہیں، نادار کون؟ میں

کیں پیاری قوم پیارے وطن سے دغائیں کیں
یہ بھی گناہ ہے تو ۔۔۔ گنہگار کون؟ میں

تنقید و احتساب کے لائق نہیں عوام
تنقید و احتساب کا حقدار کون؟ میں

جامِ ولائے ساقیٔ سرشار میرا دل
مستِ نگاہِ ساقیٔ سرشار کون؟ میں

بیگانۂ حقیقتِ جنگ آج ہر بشر
سرشار ہو کے جنگ پہ تیار کون؟ میں

ارکان میرے شعر کے تنظیم و انقلاب
تنظیم و انقلاب کا معیار کون؟ میں

شاعر سے چھیڑ!! حضرتِ منظور جائیے
یہ آپ کا خیال ہے ۔۔۔ "فنکار" کون؟ میں

نومبر ۱۹۴۶ء

(۱۵)

ملتا ہے کچھ اس ڈھب سے خود کام وفا دشمن
محسوس نہیں ہوتا یہ دوست ہے یا دشمن

عنوانِ شرارت ہے اک ہوش ربا ظالم
موضوعِ عداوت ہے ایک دوست نما دشمن

گلشن ہی میں پھولوں کی ہو جائے صبا در پے!
ساون میں بھی جھولوں کی بن جائے گھٹا دشمن

مستِ مے خودکامی فی الحال ہر انساں ہے
جب دوست نہ کام آئے کام آئیں گے کیا دشمن

اے کاش نہ ملتا میں ان مردہ ضمیروں سے
روزانہ مرے در پر دیتے ہیں صدا دشمن

احباب کی کثرت کیوں یکسو مجھے رہنے دے
پیدا تو انھیں میں سے ہوتا ہے نیا دشمن

مَیں شیر دل انساں ہوں کیوں شیر سے گھبراتا
وہ میرا کھلا دشمن مَیں اس کا کھلا دشمن

ہر چال قیامت ہے، چلتا ہے نئی چالیں
روباہ صفت انساں ہے سب سے بڑا دشمن

انساں کا عدو انساں! حیراں میں اسی پر تھا
بندہ بھی خدا کا ہے کیا کوئی "خدا دشمن"

یہ "باہنر" عارف کیا وہ "بے ہنر" صوفی کیا
ہیں سارے بنی آدم بے دشمن و با دشمن

گردش نے زمانہ کی اک نقطہ مٹا ڈالا
آگے تھی فضا دشمن ہے آج فضا دشمن

دربار میں ملتا ہے روزانہ عروج ان کو
سرکار سے پاتے ہیں ہر روز صلہ دشمن

دشمن کے خمستاں میں احباب کریں نالے!
احباب کے گلشن میں ہوں نغمہ سرا دشمن

یارانِ وطن شاید منظور یونہیں خوش ہیں
تو دوست نہ بن ان کا ان کو نہ بنا دشمن

ڈسمبر ۱۹۴۶ء

(۱۶)

ساقیا عرض میں کرتا نہیں پیمانہ دے — تیرے صدقے مجھے فردوس کا پروانہ دے

تیری سرکار میں روزانہ میں حاضر ہو جاؤں — تو اگر ساغرِ گلگوں مجھے روزانہ دے

صولت و سطوت و نقارہ و نوبت سب ہیچ — میرے کام آئے گی، دے جرأتِ رندانہ دے

نہ بچے میری لگا ہوں میں فروغِ اُمرا — مَیں بھکاری ہوں ترا، شوکتِ شاہانہ دے

وہ تری داد و دہش ہے کہ اگر چاہے تو — خُم ہے کیا چیز — چھلکتا ہوا خمخانہ دے

تُو بھی تھوک نہ دوں دشمنِ مے کے رُخ پر — دشمنِ مے سے نہیں ہے مرا یارانہ دے

میری خواہش ہے کہ میں رندِ حقیقی بن جاؤں — دے کے پیمانہ کسی رند کا افسانہ دے

میرے مشرب سے عیاں ہے مری دانشمندی — مَے بنا دے گی مجھے اور بھی فرزانہ دے

نام لکھوا کے رہا مَیں ترے مے خواروں میں — پینے آیا ہوں یہاں ساغرِ شکرانہ دے

تیرے مستوں کی رفاقت کی بدولت ساقی — میرا انداز بھی ہو جائے گا مستانہ دے

یہ جھجکنا یہ بلکنا یہ سسکنا کب تک — جام کے ساتھ مجھے ہمّتِ مردانہ دے

جا بجا یوں ہی تری دین کے چرچے تو نہیں — دے یہاں جام تو فردوس میں پیمانہ دے

در و دیوار صدا دیتے ہیں ساقی ساقی — ہر قدح خوار کو دے صدقۂ میخانہ دے

ساقیٔ بندہ نواز ایک ہی جام — مَیں نہیں بادۂ توحید سے بیگانہ دے

مجھ کو منظور ہے سرمستیٔ عرفاں ساقی
بطفیلِ عرفاؔ دے مجھے پیمانہ دے

اگست ۱۹۵۲ء

(۱۷)

دعائے نیم شبی ہو کہ نالۂ سحری — چھپائی کس نے مرے جذبِ دل کی بے اثری

حسین قوم سے میں بدگماں؟ خدا کی پناہ — جہانِ حُسن ہے گویا جہانِ فتنہ گری

مری نظر ہے وجاہت شناس دیدہ وراں — ذلیل ہو نہیں سکتا غرورِ دیدہ دری

میں آسماں سے ڈروں؟ آسماں تو کچھ بھی نہیں — بنایا مجھ کو مری بے نیازیوں نے جری

حریمِ قدس وہ "عصمت" سرا نہیں شاید — کرے نسیم کسی گلکدہ کی پردہ دری

فروغِ جلوہ گہِ دوست طور در آغوش — مری نگہ سے عیاں انفعالِ کم نظری

یہ ہے مرے دلِ امید وار کا عالم — فضا میں جیسے ہو لرزاں ستارۂ سحری

کریں گے سیرِ چمن خود بدولت و اقبال — سپیدۂ سحری اور کیا ہے؟ خوش خبری

مری شکستہ دلی آئینہ دکھائے کیسے — غضب ہے میرے حسیں دوست کی یہ خود نگری

وہاں یہ مدعیانِ کمال بھی ہیچ ہیں!! — جہاں خجل ہے مراد ذوقِ عرضِ بے ہنری

خلوص و مہر کے منظور سے مرے پوچھو
کہ اس کا دل ہے بہر حال ہر طمع سے بری

نومبر ۱۹۴۲ء

(۱۸)

کیا بُرے کیا بھلے سب زمانے — ہیں ادھورے ادھورے فسانے
ہوگئے خوار کیسا کیسا خود آرا — مٹ چکے کیسے کیسے گھرانے
اب یہ رُدن رُدن یہ گم صم فضائیں — جب وہ دھوں دھوں وہ نقار خانے
قصرِ دولت کھنڈر ہو چکا اب — کیا تنیں گے یہاں شامیانے
ساتھ ہارونؒ کے دولتِ دیں — بار قارون کا ہیں خزانے
صید گاہ ہوس خوب دیکھی — دام ہی دام دانے ہی دانے
درسِ عبرت کے یہ ڈھنگ، توبہ — تازیانے فقط تازیانے
زندہ تابندہ پائندہ باشند — ولولے مرحلے آستانے
اور کیا ہیں سوانح کے اجزا — شکریے یا گلے یا ترانے
رات غربت کی یہ کالی کالی — خواب ایسے سہانے سہانے
آہ انساں کی یہ کم نگاہی — واہ قدرت کے یہ کارخانے

ہم تو منظور کے معترف ہیں
کوئی مانے اسے یا نہ مانے

مارچ ۱۹۴۹ء

(۱۹)

تھی نظر ملانے کی آرزو زمانے سے
ہوش ہو گئے رخصت کیوں نظر ملانے سے

مل گیا پتہ ان کا دیکھ لی گلی ان کی
کیوں نہ مطمئن ہوں میں لگ گیا ٹھکانے سے

ذوقِ دیدِ پیہم بھی کاش وہ عطا کر دیں
لطفِ سجدہ پاتا ہوں جن کے آستانے سے

دیکھ دیکھ کر مجھ کو مے پلائی ساقی نے
جھوم جھوم کر اٹھا میں نشاط خانے سے

سرگذشتِ دل میری ۔۔ واہ واہ کیا کہنا
بن گئے فسانے کچھ اک اسی فسانے سے

بے قرار کرنے کی آگئی ادا ان کو
باز اب نہ آئیں گے وہ نظر چرانے سے

خوش "توجہِ خاطر" کر رہا ہے دونوں کو
دوست کیوں پریشاں ہو دوست کے ستانے سے

مضطرب نہیں ہوں میں مطمئن نہیں ہوں میں
دل کی آج یہ حالت! وہ بھی جی لگانے سے

کیا غضب ہے اے منظور اس بتِ پریوش کا
مسکرا کے اٹھ جانا نیند کے بہانے سے

اکتوبر ۱۹۴۰ء

(۴۰)

دردِ دل بار بار کیا کہئے
خود ہیں وہ شرمسار کیا کہئے

اعتبارِ نظر ہیں دونوں بھی
یہ خزاں یہ بہار کیا کہئے

ایسی بے اعتبار دُنیا میں
اعتبار اعتبار کیا کہئے

بے سبب ہی تڑپ رہے ہیں ہم!
حاصلِ انتظار کیا کہئے

درد ہے درد تھا رہے گا درد
دل کا انجام کار کیا کہئے

رہ گئی یاد وضعداروں کی
کون ہے وضعدار کیا کہئے

عشق بے اعتبار ہے ہوگا
حُسن اور اعتبار کیا کہئے

ان کی رنجیدگی نہیں منظور
کیوں ہے دل بے قرار کیا کہئے

مارچ ۱۹۴۹ء

(۲۱)

میرے رونے پر ہنسے وہ تو میں رویا اور بھی
یکدلی کا راز ہیں کیسا یہ دورنگی طور بھی
وہ اضافہ اور کرلیں بانکپن میں، کر کے جور
کیا خبر ان کو کرم ہے میرے حق میں جور بھی
اس خودی پر جاں فدا اس بیخودی پر دل نثار
دیدنی ہے خاص ادا بھی عامیانہ طور بھی
پڑتی ہے میری نظر ہر پھر کے اپنے دل پہ کیوں
میں نہیں واقف تو کیا ناکام ہوں گے اور بھی
رازِ تنویرِ دماغ افسانۂ دل ہے، مگر
احتیاطاً رات بھر کرتا ہوں اس کا دور بھی
کہہ نہیں سکتا دل ان کو میں نے یونہی دے دیا
یا مآلِ عشق پر کچھ کر لیا ہے غور بھی
ہے مرے اچھے تصور کا بھی کیا اچھا مآل
چشمِ رحمت بن گئی ان کی نگاہِ جور بھی
یہ حیات افروز ساقی یہ توجہ یہ اثر
کیف آور بزم بھی ہے جام بھی ہے دور بھی
بعدِ دہلی ہم کو اے منظور اردو کی قسم
حیدرآبادِ دکن بھی یاد ہے لاہور بھی

(۲۲)

سحرِ نگاہِ شعبدہ ساماں نہ پوچھیے — کیا ہو گیا ذخیرۂ ایماں نہ پوچھیے

طرزِ خزاں سلوکِ بتاں رنگِ آسماں — سب پوچھیے مگر مرے ارماں نہ پوچھیے

یونہی سمیٹ لی نہیں دنیائے اضطراب — ذوقِ نمائشِ غمِ پنہاں نہ پوچھیے

نادم ہوئے تھے آپ کبھی اپنے ظلم پر — کب سے ہوں اپنے دل میں پشیماں نہ پوچھیے

ہیں ماورائے دشت و چمن حال مستیاں — صحرا عزیز ہے کہ گلستاں نہ پوچھیے

دل میرا کیوں ہے سوئے خمستاں یہ ہے عیاں — مانوس مجھ سے کیوں ہے خمستاں نہ پوچھیے

ہے حاصلِ مشاہدہ کائنات کون — کس کے مشاہدہ کا ہے ارماں نہ پوچھیے

مہرِ جہانِ رازِ محبت دل نشیں! یہ کیا — اسرارِ جلوۂ صنمستاں نہ پوچھیے

سترِ نشاط در ازالمِ گفتنی ہے کیا — جی چاہے پوچھنا بھی اگر یاں نہ پوچھیے

میں بھی ہوں سب کی طرح کبھی خوش کبھی ملول — میرا پیام کیوں نہیں یکساں نہ پوچھیے

منظور ابھی خودی ابھی مرغوب بے خودی
مجھ سے مری پسند کا عنواں نہ پوچھیے

مئی سنہ ۱۹۵۰ء

(٢٣)

مرا دل ہی نہیں ہے حُسن کے اسرار دانوں میں
مری نظریں بھی ہیں اس کے حقیقی ترجمانوں میں

بڑھائیں دھیرے دھیرے ان کی جانب بہرِ سرگوشی
صدائیں دھیمی دھیمی ان کی آئیں میرے کانوں میں

جوانی ذوق پرور حُسن دلکش گفتگو پیاری
نہیں ان کی ادا بھی دوسرے شیریں زبانوں میں

تصنّع ان کی خواب آلودہ آنکھوں سے ہے بے پردہ
بہانہ نیند کا پھر بھی ہے دلکش کُل بہانوں میں

انھیں کے زیرِ سایہ ہے فروغِ گلشنِ اِمکاں
چھپی بیٹھی ہیں دوشیزہ بہاریں جن مکانوں میں

مرا دل غیر کے قبضے میں جائے! جا نہیں سکتا
نہیں کیا کم نگاہی ان کی اس کے پاسبانوں میں

اثر اللہ والوں کی زباں کا ـــــ واہ کیا کہنا
نہیں تاثیر کچھ کم ان بُتوں کی بھی زبانوں میں

خدا شاہد، اسی سادہ دلی پر جان دیتا ہوں
نہ کہنے کی بھی باتیں کہہ گئے، وہ میرے کانوں میں

ہُوا مسحور ان سے کس قدر میں، کہہ نہیں سکتا
کھُلے شکووں کے دفتر جب محبت کے فسانوں میں

بلند اقبال انساں امتحانوں سے نہیں ڈرتے
نویدِ نو بہ نو کی جھلکیاں ہیں امتحانوں میں

ہمارے ہی زمانے میں ہیں ساری گردشیں شاید
زمیں کیا گھومتی رہتی نہ تھی اگلے زمانوں میں

نکیں ہیرے کو پرکھیں لعل کو جانچیں زمرد کو
سکونِ دل نہ ڈھونڈیں بوالہوس اپنے خزانوں میں

ارے یہ سکۂ زر بھی ہے کیا چلتا ہوا جادو
نہیں اس کی بدولت فرق بوڑھوں میں جوانوں میں

نہ جبرائیں زمیں کے زرکدوں سے دست کش ہوتا
نہ داماں نظر میرا الجھتا آسمانوں میں

یہاں اندھے بھلا کاہے کو لکڑی ٹیکتے آئیں
نظر آتے ہیں آنکھوں والے ہی آئینہ خانوں میں

مکاں یہ میکشوں کے ہیں دکانیں مغبچوں کی وہ
مکانوں سے دوکانوں میں دکانوں سے مکانوں میں

مجھے کیا دولتِ جاوید دے گی مادی دنیا
یہ دولت بھی تو پوشیدہ ہے روحانی خزانوں میں

ادیبوں کو ادب آداب سمجھائے نہ کیوں اردو
پلی اونچے مکانوں میں بڑھی اعلیٰ گھرانوں میں

زبانِ مادری سے اُنس ہر انساں کو ہے طبعاً
نظر آئی مجھے اردو ہی دلکش سب زبانوں میں

مزے کے شکوے لے لے کر مزے یونہی سنے ہیں کیا
جواب ان کا سناتا جاؤں گا اپنے ترانوں میں

جگہ منظور کی ہے حال مستوں میں، یہ متوالا
نہ ان کے نکتہ چینوں میں نہ ان کے مدح خوانوں میں

مئی ۱۹۴۶ء

(۲۴)

میرے دل کے وہ جب مقابل تھے
خود بھی محوِ "لطیفۂ دل" تھے

آئے بیٹھے چلے گئے کیا خوب
وہ تو اب دیکھنے کے قابل تھے

کرلیا طے سلوک راہ رہے ہیں
ان کے جلوے نشانِ منزل تھے

دل نہ دینا انھیں، نہ تھا آساں
خود وہ در پردہ دل کے سائل تھے

یہ تب و تاب بے دلی سے ہے
ہم بھی صاحب دلوں میں شامل تھے

ان مشاغل کو ہم نے اپنایا
ترکِ مقصد کے جو مماثل تھے

ہے طبیعت شگفتہ سلجھا کر
دلکشا عقدہ ہائے مشکل تھے

لطفِ طوفاں اٹھا رہے تھے ہم
دور پژمردگانِ ساحل تھے

میر کی منقصت ہمیں منظور
ہم ہیں ناقص ابھی وہ کامل تھے

دسمبر ۱۹۵۱ء

(۲۵)

ہوتا ہے دیدِ حق سے یہاں بہرہ ور مجھے
دیں بُت خدا کے نام "خصوصی نظر" مجھے

دانش بقدرِ بینش و بینش بقدرِ کیف
کافی ہے یہ مشاہدۂ مختصر مجھے

مَیں دیکھتا ہوں ان کا غرورِ نگاہ کب؟
آئینہ دیکھتے ہیں وہ جب دیکھ کر مجھے

انجامِ دل، نتیجۂ الفت، مآلِ دید
سب کچھ دکھا رہی ہے کسی کی نظر مجھے

منزل شناس و منزلت آگاہ دوست ہوں
ٹوکے گا کون "سجدۂ ہر گام" پر مجھے

او شوخ چشم! حُسنِ توجہ سے کام لے
کچھ اور چاہیئے خلشِ کارگر مجھے

زلفیں تری سجاؤں بس اتنی ہے آرزو
کب میں نے یہ کہا کہ پریشاں نہ کر مجھے

بن کر رہیں گی گدگدیاں چٹکیاں ضرور
محسوس ہو رہا ہے ان اشعار پر مجھے

ہیں اور بھی جراؤں خود ان کی تلاش ہے!
آوارہ ہوں بنائیں وہ آوارہ تر مجھے

لینے لگا ہوں نام میں ان کا اسی قدر
آنے لگے ہیں یاد وہ اب جس قدر مجھے

یہ معجزہ تو ان کے تصور کا خاص ہے
آتی ہے نیند ہجر میں بھی رات بھر مجھے

موقع ملے کبھی تو مجھے عرضِ حال کا
مَیں ان کو دل دکھاؤں وہ دیکھیں اگر مجھے

منظورؔ کی نظر میں ہوں کم ہیں تو غم نہیں
ہر دیدہ ور نے مان لیا دیدہ ور مجھے

نومبر ۱۹۵۲ء

یہ خاموشی یہ محبت یہ خوش نگاہی
مزہ اب بھی نہ دے یادِ الٰہی!

عیاں حسنِ ازل کی جھلکیاں ہیں
خوشا تاثیرِ وردِ صبح گاہی

حیا بے پردہ شوخی بھی نمایاں
نہیں راز ان کی دزدیدہ نگاہی

ہنسی کی خندہ بھی کتنی دلربا ہے
میں اپنے دل کی خود دیکھوں تباہی!

یہ کیسا رنگ بدلا آسماں نے
نہ دھانی ہے نہ انگوری نہ کاہی

جہاں آکر گلے ملتے ہیں دکھ سکھ
وہیں جاکر بھٹک جاتے ہیں راہی

اسی پر ان کو غصہ آگیا ہے
کہ اپنی وضع میں نے کیوں نباہی

نہیں چشمِ سخن گو کو یہ عادت
زباں بکتی رہی واہی تباہی

ہوا معدوم یہ فتنہ بھی ناپید
کہاں ہے اب غرورِ کج کلاہی؟

یہاں تو کرسیاں جمہور کی ہیں
کہاں رکھو گے لاکر تختِ شاہی

نمائش ہے نمائش عدلِ سلطاں
تماشا ہے تماشا دادخواہی

سیاست کا ترانہ گاتے گاتے
پھر آئی یاد ان کی خوش نگاہی

بجان و دل تواضع ان کی منظور
سمجھ تو لوں مآلِ سربراہی

جون ۱۹۵۲ء

مجھے ان سے ملنے کی عزّت ملی
یہ دولت وفا کی بدولت ملی
ملی ان کو ہی دیکھنے کے لئے
بصارت ملی یا بصیرت ملی
مجھے دیکھ کر مسکرانے لگے
سنورنے سے جب ان کو فرصت ملی
کہوں کیوں کر اے دلبرِ کم سخن
تری بات میں کیا حلاوت ملی
مرا "ظرف" کل تک رہا زیرِ غور
مجھے ساقیا آج اجازت ملی؟!
کہاں فتنہ قامت قیامت کہاں
بھلا اس سے اٹھ کر قیامت ملی!!
ستاروں نے ہلچل مچا دی ادھر
ادھر مجھ کو دم بھر جو راحت ملی!!
مرے شعر منظورِ اہلِ نظر
میں خوش ہوں کہ موزوں طبیعت ملی

ستمبر ۱۹۵۳ء

دور گذر گئے کئی　　اک یہی میرا کام ہے
دل کا فسانہ آج بھی　　قصۂ ناتمام ہے
میری یہ حال مستیاں　　ان کی یہ چیرہ دستیاں
دل تو بہل چکا یہاں　　یہ بھی تو دھوم دھام ہے
قبضۂ دوست میں رہی　　اک مری کائنات ہی
ورنہ تغیرات کی　　زد میں ہر اک نظام ہے
میری زبانِ حال کا　　بھید خود ان پہ کب کھلا؟
مہر و وفا کا ادعا　　مشغلۂ عوام ہے
"منظرِ بے نمود" دل　　کیا ہے جہانِ آب و گل؟
کیوں نظر آئے وہ تجلی　　جس کا یہ دل مقام ہے
ساقیٔ دل نواز نے　　جام وہ دے دیا مجھے
چھاؤں میں جس کی چین ہے　　زندگیٔ دوام ہے
صبح کے طور شام میں　　مجھ کو یہاں دکھائی دیں
ہجر میں تیرہ دل کہیں　　صبح نہیں یہ شام ہے
عہدِ فراق میں کبھی جو　　رازِ نشاط و عیش ہو
رمز شناس دوستو　　یہ تو اسی کا نام ہے
حسن کا ہر معاملہ　　حسن کا ہر مشاہدہ
قابلِ احترام تھا　　قابلِ احترام ہے

طرزِ قدیم تا بہ کے آج نوائے پختہ ہے
گیت نہیں، سندیش ہے، نظم نہیں، پیام ہے

ان کی نظر کے سامنے میرا کلام ہی سہی　　دادِ سخن وہ دیں مجھے اس پہ انھیں کلام ہے

نومبر ۱۹۵۳ء

رُباعیات

قبل از مینوشی

عرفاں کا رنگ تیرے دل میں رچ جائے　　زاہد! یہ خاص جام تجھ کو جچ جائے
پسخوردہ ترا بھلا کیسے ملتا ہے　　میں پی لوں گا جو "اتفاقاً" بچ جائے

بعد از مینوشی

زاہد نے شراب پی ہے ــ پچ جائے گی　　دنیا میں اب اس کی دھوم مچ جائے گی
اک جام طلب اور کیا! واہ رے دل　　ساقی کی محبت اس میں رچ جائے گی

نو مست پرانے مینوشوں میں

میکش "زاہد" پڑا ہوا ہے بے ہوش　　یہ رنگ کہاں نصیب ہر عشرت کوش
بے ہوشی بھی ہے ہوش آور اس کی　　جھوٹے "نو مست" ہیں پرانے مینوش

زاہد نواز ساقی

میخانہ چمک اٹھا ــ یہ جلوہ کیسا　　خوش ہو "زاہد نواز ساقی" ایسا
کچھ چشم سخن گو کا اشارہ سمجھے　　ہم کر سکتے نہیں سب کو زاہد جیسا

ساقی نظامِ عالم کو قائم رکھنا چاہتا ہے

سرشار ہوں سب، نہیں یہ ساقی کو پسند
ہشیار بھی کچھ رہیں یہاں حاجت مند
سرشار غنی ہیں، ہوش والے محتاج
ہموار نہ ہو جائیں کہیں پست و بلند

ساقی کی خیر بادہ خواروں کی خیر

اللہ اللہ ایسے ساقی سے بیر
لڑنے آئے ہیں مجھ سے بلّی ناحق غیر
منظور نہیں جنگ، مناتا ہوں میں
ساقی کی خیر بادہ خواروں کی خیر

مُریدوں کا یہ انجام

قصباتی ہوں مرید یا ہوں شہری
کس کو نہیں پیروں سے عقیدت گہری
گہری گہری عقیدتوں کا انجام
پکے پکے موحّد اب ہیں دہری

نہ پیروں کا خوف نہ مریدوں کا ڈر

ہر ایک "مُرید" صاحبِ نیشہ ہے
لیکن، مجھے کب جان کا اندیشہ ہے
کہتا ہوں بہ بانگِ کرس میں کہتا ہوں
"پیری" پیشہ ہے مستقل پیشہ ہے

موازنہ

محکوم ہے نوکروں کا ریشہ ریشہ
ان کے لئے کب نہیں نیا اندیشہ
اندیشہ بغیر وہ اُڑاتے ہیں مزے
پیری کو بنا لیا جنھوں نے پیشہ

کچھ سوچ کرہی قلم اٹھایا ہے

اپنوں سے کہا پیر نے لے لے کے مزا　　ہیں سب یہ ڈھکوسلے سزا ہے نہ جزا
برباد ہوئی جس کی زبانی بکواس　　منظور نے اُس کو قلمی دی ہے سزا

پوچھنے کی کیا بات ہے

میں مولویوں سے اور پیروں سے لڑوں　　یا راہزنوں سے اور امیروں سے لڑوں
تو یہ ہے سوال۔ ان سے لڑوں یا ان سے　　لڑنا ٹھیرا تو سب شریروں سے لڑوں

مولوی صاحب

گل بزم سے کیوں سلام کے طالب ہیں　　یہ کون ہیں؟ ان کے ہوش کیا غائب ہیں
اچھا! منبر پہ چڑھ رہے ہیں حضرت!!　　اب میں سمجھا یہ مولوی صاحب ہیں

پیر و مرشد

ہے شاملِ اشغال جو ذکرِ ارّہ　　پیر و مرشد ہیں اور بے جا غرّہ
کہتے نہیں "شرحِ صدر" کا حال وہ کیوں　　خورشید ہے جن کی رہ کا ذرّہ ذرّہ

اللہ رے پیر

چھا جاتے ہیں کیا صرف مریدوں پر پیر　　ساری مخلوق سے ہیں بالاتر پیر
شاید یہی رازِ "من خدایم" ہوگا　　ہے مُدّعیِ خدا اُنسانی ہر پیر

اعلانِ یافت

بُت خود نہیں قابلِ ستائش ۔ سمجھے
کرتا ہوں میں حُسن کی پرستش ۔ سمجھے

ہم معنیٔ حُسنِ فہم ہے حُسنِ نظر
بینش مری بن چکی ہے دانش ۔ سمجھے

کم سخن معشوق ہوتے ہیں نہ کہ شاعر

مرغوب ہے گُل رخوں کی غنچہ دہنی
زیورِ محبوبیت کا ہے کم سخنی

شاعر ہوں، کہے جاؤں ۔ نہ سوچوں یہ بھی
کس وقت مری بات بنی کب نہ بنی

انکارِ حُسن کفر باشد

محروم حسینوں سے نہ جنّت نہ زمیں
واللہ کسی حسیں کا منکر میں نہیں

ایمان کی پوچھو تو زمیں کی پریاں
ظاہر ہوئیں حُوروں کا دلانے کو یقیں

تقابل و تعارف

ماضی کے لُغات خوشنما دوشیزہ
بالا، بالا، صدف، گہر، آویزہ

فی الحال الفاظِ جدّت آراستی
باہیں، خنجر، جنم، ملاپ، آمیزہ

کیا خُوب

فطری ہر اقتدار کے قائل بھی
فطرت کے کاروبار میں حائل بھی

یہ ہیں تعلیم یافتہ جنٹلمن
"شادی بیزار" بھی طرب مائل بھی!!

اظہارِ حقیقت

شادی کر لی تو مٹ گئے سارے دُکھ
عشرت مرزا ہیں اور ہے سُکھ ہی سُکھ
رونی صورت بنائے اب ان کی بلا
بیوی ہنس مُکھ تمام سبچے ہنس مُکھ

اعلانِ صداقت

یہ دینِ محمد ہے کہ وہ دین دیال
کس پر نہیں فرض خدمتِ اہل دعیال
ہیں بے خبر اَلْخَلْقُ عِیَالُ اللہ سے
افسوس فقط اپنی ہی راحت کا خیال

تارکانِ رسم و رواج

پروا نہیں حور کی پری چاہتے ہیں
شادی سے غرض نہیں، خوشی چاہتے ہیں
نو عمر ہیں دشمنِ "غمِ رسم و رواج"
ہر روز دُلہن نئی نئی چاہتے ہیں

نظم کُشا

حکما میرے بھی بزرگ ہیں

ہندی زیرک، عرب کے معقول پسند
سمجھائیں حکیموں کے مقامات بلند
نیچا ہیں دکھاؤں ان سرافرازوں کو
اپنوں کی مخالفت کرے دانشمند

تردیدِ فلسفہ دشمنی

دیکھا نہیں وہم و علم کا دوراہا
روشن علم الیقیں کو رکھنا چاہا
ہیں فلسفہ دشمن! آپ مجھ سے بدظن
منظور شگونِ دل ہے عالیجاہا

برہم کنِ شگونِ دل

نظارہ کی حد ہے آسماں کہتا ہے
نظارہ کی حد ہی کو دھواں کہتا ہے
آئینہ میں عکس دیکھتا ہے جس کا
لاشئے اسے یہ فلسفہ داں کہتا ہے

ایسے فلسفہ سے شاعری ہی اچھی

ہے فلسفہ ڈارون کا اتنا معصوم
آتی ہے ہنسی سمجھ کے اس کا مفہوم
اب دائرۂ شعرِ سخن چھوڑے کون
معلوم حدِ فلسفہ دانی معلوم

شاعرانہ مخاطبت

لاشئے ہے کبھی کبھی دھواں کیا کہنا
ہے حدِ نظر یہ آسماں کیا کہنا
پانی میں نظر سایۂ حدِ نظر آئے!
اے ہیچمداں فلسفہ داں کیا کہنا

دوستانہ مشورہ

ناداں عرفا سے دیدہ ور ہے بےشک!
ضدِ عین الیقیں تھا اندھا شک
جی چاہے تو ربط پاکبازوں سے بڑھا
اے فلسفہ داں فلسفہ بازی کب تک

فروری ۱۹۵۷ء

مفرحِ دل

افہام و تفہیم

قدرت ہے خدا کی حُسنِ صورت کیا ہے
ان کی دُھن میں ہوں اور عبادت کیا ہے
کر دی میں نے تو حُسن کی کچھ تعریف
سمجھا دیں وہ مجھے محبّت کیا ہے

بھولا پن

حُسنِ معصوم ان کا سمجھے گھاتیں!
بچھا کے بساط کھا رہے ہیں ماتیں
اللہ اللہ ان کا یہ بھولا پن
بُت میں نے کہا شروع کر دیں باتیں

حُسن ہی حُسن

دلکش رفتار دل رُبا ہے گفتار
جاں بخش اطوار جانفزا ہے کردار
صورت سیرت حسب نسب الحاصل
ہر خوبی کا ہیں وہ اک اچھا معیار

مظاہرۂ کمال

اپنے جوہر دکھا رہے ہیں وہ خود
آئینہ اٹھا کے لا رہے ہیں وہ خود
آئینہ میں دیکھ دیکھ کر اپنا جمال
تصویر اپنی بنا رہے ہیں وہ خود

سرقہ پُر لطف

ان کو یوں ہی تصویر بنانے دوں گا
بیٹھے ہیں جہاں وہ، میں وہاں بیٹھوں گا
اٹھ جائیں گے وہ تو اپنے دل کی خاطر
میں اپنے گریباں میں اسے رکھ لوں گا

مئی سنہ ۱۹۵۵ء

چندہ کا دھندا

ہے خدمتِ قوم کا گلے میں پھندا
خاصے کی ہے چیز ان کا "چالو دھندا"
خوش خوش بھیکو میاں نظر آئیں نہ کیوں
یہ قوم کے ۔۔۔ قوم ان کی ۔۔۔ قومی چندا

تغلب؟ نہیں تصرف!!

بھیکن بھائی کا دل پراگندہ ہے
کیا اب بھی جبیں ان کی پُر از خندہ ہے
ہے بہ "دیوالیہ" وہی ملکی بینک ۔۔۔!
جس میں محفوظ قوم کا چندہ ۔۔۔ ہے

چندہ کا صندوق

دیکھا جب نفع قوم کے دھندے میں
سائل بیگ آ کے پھنس گئے، پھندے میں،
ہیں قوم کے دعیان میں یہ قیاس! غلط
چندہ صندوق میں ہے، دل چندے میں

وہم کی ایک نئی شاخ

ہے شیخ بھکاری کا تخیل گندہ
خود ہی کہتے ہیں خود کو "وہمی بندہ"
اپنی ہی رقم کا وہم انھیں ہے اس پر
صندوق میں ان کے ہے جو قومی چندہ

چندہ کی رسید

چندا صاحب نے کل بآئین جدید
جنت کے معاملہ میں کی گفت و شنید
کاغذ کا یہ پرزہ ہے کہ پروانۂ خلد؟
"پروانۂ خلد" ہے کہ چندہ کی رسید

اکّا دکّا

جو کچھ اس نے کہا ہمیں ز بسکہ ماننا پڑا اس کو
نثار اس دعوئ باطل پہ سرمایہ حقیقت کا

ہشیار ہیں، تیور مرے پہچان گئے ہیں
کیوں دیں وہ مجھے موقعِ اظہارِ تمنا

انگڑائی وہ لیتے ہیں تو دل لے کے رہیں گے
بے وجہ تو یوں ہاتھ اٹھایا نہیں جاتا

جب تک ہوا طلب مرے دل کا غبار تھا
عبرت فروش غازۂ روئے نگار تھا

میرے دل کی بھی کلی دیکھئے مرجھانے لگی
میں نے ناحق گلِ خنداں کو دوبارہ دیکھا

دل اس کا چین کیا پائے جس انساں کو خیال آئے
گلستاں میں بیاباں کا بیاباں میں گلستاں کا

مرے حوصلے یہ کب تھے کہ نظر ملاتا اس سے — اسے دیکھتا میں چھپ کے جو وہ آشکار ہوتا

اس کے چہرہ سے بھی نورِ مدعا ہے جلوہ ریز — پوچھ کر ارمان جس نے مجھ کو حیراں کر دیا

اپنے جلوہ کے لئے بیتاب تھا مدت سے کون — محوِ حیرت ہوں کہ میں آئینہ کس کا بن گیا

آپ کے الطاف سے ظالم بنا جاہل بنا — "قابلِ بارِ امانت" غور کے قابل بنا
ہیں عیاں انوارِ حق تم سے مگر یہ تو کہو — کس کا خالِ رُخ جمالِ چہرۂ باطل بنا

واہ بے تار کی پیغام رسانی اے دل — ملتی جاتی ہے مجھے ان کی خبر آپ سے آپ
شرطِ موسم نہیں اس کے لئے ہر موسم میں — بارشِ نور ہوئی وقتِ سحر آپ سے آپ

پینا ہے جامِ صحبتِ پیرِ مغاں سے مجھے — میرے ہی ڈھب کے چاہئے کچھ میہماں مجھے

یہ بھی اک رسمِ محبت ہے۔ بڑھانے کو خلوص — ہم گلہ ان سے کریں اور وہ شکوہ ہم سے
ہم کو دنیا خس وخاشاک سمجھتی ہے مگر — ہم سمجھتے ہیں کہ چلتی ہے یہ دنیا ہم سے
حدِ غزل کی انھیں معلوم ہے لیکن اکثر — بھائی منظور بھی اڑتے ہیں کچھ اونچا ہم سے

دیکھ کر مجھ کو وہ منہ پھیر نہیں لیتے فقط — کج ادائی کی جھلک ان کے ہر انداز میں ہے

دشت غم وہ مجھ کو گلستاں ہے، گلستاں کی طرف | جس کے دل میں ہوسِ سیرِ گلستاں ہو، جائے
گُل رخانِ چمنستانِ الٰہی جو نہ ہوں | یہ مرا گلکدہ بالفعل بیاباں ہو جائے

تیرے ہی تصوّر کی یہ کارگزاری ہے | تصویر تری دل پر مَیں نے نہیں کھِچوائی

سادہ روئی جس کی ہے حیرت فروشِ آئینہ | آئینہ مانگوں اسی سے چشمِ حیراں کیلئے!

شکوۂ "جور پیشہ" ہے حاصلِ ذوقِ زندگی | ورنہ دل ادا طلب خود ہی جفا پسند ہے

مدعا ہستی و نیستی کا کیا ہے | کیا ہے پوشیدہ، برملا کیا ہے
مجھ کو حیرت سے دیکھتا کیا ہے | تو ہی تو ہے ترے سوا کیا ہے
کچھ اگر ہے مجھے بتا کیا ہے

سبب کچھ ناامیدی کا نہ پوچھو | مرا دل تم سے یونہی بدگماں ہے

اثر نظر نہیں آتا کہیں، اثر ہے اب | تری نظر کے لئے یاری زباں کیلئے

کہوں گا اس کو مَیں سِرِّ حقیقت اے منظور | زبانِ رانہ میں بُت کو خدا کہا کس نے

پھر وہی کیف دماغ پھر وہی ساغر و سبو | پھر وہی عام گفتگو پھر وہی خاص مشغلے

کسی کے ہونے کا تھا وہ دھوکا یقیناً اب تک جو ہم سفر تھا
رفیق کون اس کی رہ میں ہوتا کوئی مرا ہم سفر نہیں ہے

تڑپ جاتا ہوں یادِ کارواں سے
نہ پوچھو ساتھ چھوٹا ہے کہاں سے
خوشا سادہ دلی کہنے لگے ہیں
وہ میرے دل کی بات اپنی زباں سے
خوشی منظور ہے مجھ کو انہیں کی
کہاں جاؤں میں ان کے آستاں سے

دیکھو آسے ہم عہد بزرگوں سے ملا کر
اگلوں کا اگر کوئی مرقع نظر آئے
نظارۂ رنداں ہے فرح بخش دل و جاں
حسرت ہے کہ ہر سو یہی مجمع نظر آئے

اب کیا کہوں حالت اپنے دل کی
انگڑائی وہ شوخ لے رہا ہے

میں مطمئن اس کو حق سے نہیں ممکن ہے، اگر، آ بسم اللہ
اے شیخ حقیقت اس بت کی پوشیدہ نہ کر باطل کر نے

خوش ہوں کہ انہیں مجھ کو رلانے کا ڈھب آیا
ایکاش مجھے ان کو ہنسانے کا ڈھب آجائے

یوں پوچھے آ کے صبح کو تو لطفِ انتظار!
آنکھوں میں کٹ گئی ہے ستمگر تمام رات

رشک اک چیز ہے کام اس سے اگر لینا آئے
ورنہ اس رشک سے انسان ہے بدنام بہت

پُرخطر ہے رہِ ملکِ عدم و ملکِ وجود — کوئی آنے کو ہے راضی نہ کوئی جانے کو
بھٹیاں اتنی ہی بس! پیرِ مغاں غور تو کر — چند ہفتے ہی تو باقی ہیں بہار آنے کو

بت ہنسی میں ہی اڑائیں مری نادانی کو — دامنِ کفر میں پالا ہے مسلمانی کو
جورِ بے جا پہ عجب شان تھی ان کے رُخ کی — مَیں نے جھینپنے نہ دیا رنگ پشیمانی کو
شیخ جی دودن کی لیتے ہیں، میں چپ ہوں گویا — جانتا ہی نہیں حضرت کی خداداتی کو

آبِ حیواں بھی حیاتِ جاوداں اس کو نہ دے — جس بقا مشتاق سے منزل فنا کی طے نہ ہو
عکس اپنا دیکھ کر آئینہ خانے میں یہ دھوم — کیا خبر کب تک من و تو کا قضیہ طے نہ ہو

غیر ممکن ہے کہ یہ خورشید رُو پردا کریں — جن کے آگے چاند شرمائے وہ پردا کیا کریں

تری درسگاہ کی راہ سے غرض اے فقیہ نہیں مجھے — میں ادھر نہ آؤں خدا کرے یہ بتوں کی راہگزر نہیں

شیخ سے خود پسند کی رائے کا اعتبار کیا — مجھ کو خدانخواستہ اہلِ نظر بُرا کہیں

دل لیا، چرکے دیئے، ہنستا رہا ہنسنے کے بعد — اس نے پوچھا کیا ہوا؟ میں نے کہا کچھ بھی نہیں

مطمئن تھا میں پراگندہ دل انسانوں میں — لکھ دیا کس نے مرا نام غزل خوانوں میں
چوٹیاں جلوہ گہہِ دوست کی چھو لیں اب بھی — جان اتنی ہے مرے غمزدہ ارمانوں میں
مَیں ترے حسن کے معیار پہ جانچوں انھیں کیا — مہر و مہ خود نظر آتے ہیں پشیمانوں میں

J & K UNIVERSITY L
Acc. No ....
Date